

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نشاط الم	نام کتاب :
رؤف رحیم	مصنف :
(۱۱۲)	صفحات :
۱۹۹۶ء	سن اشاعت :
(۵۰۰) پانچ سو	تعداد :
محمد عبدالرؤف	کتابت :
دائرہ پریس چھپتہ بازار حیدر آباد	طباعت :
حفیظیہ بک بائینڈنگ چھپتہ بازار	جلد بندی :
ادبستان دکن، بہ یادگار حضرت صفی ادنگ آباد	ناشر :
جناب محبوب علی خاں اختر	زیر اہتمام :
۵۰ روپے، لائبریری کیلئے / 80 Rs	قیمت :
بیرون ملک: 10 ڈالر	سرورق :
	سعادت علی خاں

یہ کتاب اردو اکیڈمی آنڈر پبلیکیشن کی جزوی مالی اعانت سے شائع ہوئی۔

: چلنے کے پتے :

- حُسامی بک ڈپو، مچھلی کمان حیدر آباد،
- اسٹوڈنٹ بک ڈپو، چار پیار حیدر آباد،
- دفتر شگوفہ، بچلر کوارٹر معظم جاہی مارکٹ،
- توسط احمد شمس الدین مکٹر فرزند رؤف رحیم ۲-۵-۵۲۵ شکر گنج حیدر آباد

فہرست

- ۱۔ _____ اِعتاب _____ ۲
- ۲۔ _____ اپنے بارے میں _____ رُوفِ رحیم _____ ۵
- ۳۔ _____ رُوفِ رحیم کی شاعری _____ محمد نور الدین خاں _____ ۸
- ۴۔ _____ رُوفِ رحیم میری نظر میں _____ محبوب علی خاں اٹک _____ ۱۰
- ۵۔ _____ نشاط الم (مقدمہ) _____ ڈاکٹر راج بہادر گروہر _____ ۱۱
- ۶۔ _____ تاثرات _____ پروفیسر غوان چشتی _____ ۱۷
- ۷۔ _____ " _____ پروفیسر یوسف مرث _____ ۱۸
- ۸۔ _____ " _____ حضرت سید نظیر علی مدیل _____ ۱۹
- ۹۔ _____ حمد باری تعالیٰ _____ ۲۱
- ۱۰۔ _____ مناجات _____ ۲۲
- ۱۱۔ _____ نعتِ اقدس _____ ۲۳
- ۱۲۔ _____ سلام _____ ۲۵
- ۱۳۔ _____ منقبت _____ ۲۶
- ۱۴۔ _____ غزلیات _____ ۲۷ تا ۱۱۱
- ۱۵۔ _____ تعارف _____ ۱۱۲



استاد محترم ماہرِ علم عروض حضرت سیدِ نظیر علی عدیلِ مرحوم
جن کی ہدایات میرے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

اور

میرے مشفق محترم محققِ دکن لڑاب محمد نور الدین خاں صدر
ادبستانِ دکن کے نام۔

رؤف رحیم
(ایم اے)

پیش لفظ - اپنے بارے میں

قارئین کرام!

”نشا طالم“ سے قبل میرے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں جس کی آپ نے پذیرائی کی۔ سنجیدہ غزلیات کا مجموعہ ”بساط دل“ فخر الدین علی احمد سمیٹوں کھٹی لکھنؤ اتر پردیش کی مالی اعانت سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا جسے اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے انعام سے نوازا۔ اسی ہمت افزائی نے مزاحیہ غزلیات کے مجموعہ ”خدا خیر کرے“ کی اشاعت کے لیے راغب کیا۔ جو اردو اکیڈمی آندھرا پردیش میں ۱۹۸۹ء کے مسودات کی منظوری کے بعد ۱۹۹۱ء میں جزدی اعانت سے شائع ہوا۔ زندہ دلاں حیدر آباد نے بھی جزدی مالی اعانت کی اور خدا خدا کر کے ”خدا خیر کرے“ منظر عام پر آیا اور اس کی بھی پذیرائی ہوئی۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے انعام اور اعزاز سے نوازا۔ وزیر تعلیم مٹری وی رنگا راؤ نے توصیف نامہ اور میڈل عطا کیا۔ جس کے لیے میں اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا ممنون ہوں۔

شاعری یوں تو خدا داد صلاحیت ہے لیکن ماحول اور فیضِ محبت سے یہ ابد تکھڑی ہے۔ میری شاعری کا آغاز ۱۹۷۶ء میں ہوا جو والد مرحوم حضرت شمس الدین تبااں کے فیضِ صحبت نظرِ کرم اور شفقتِ پدرانہ کا اثر تھا۔ میرے آوارف کے لیے یہی کافی ہے کہ میں دکن کے ممتاز شاعر حضرت محمد شمس الدین تبااں کا چوتھا لڑکا ہوں جو حضرت صفی اللہ نگ آبادی کے شاگردِ رشید تھے۔ ۱۰ جون ۱۹۵۴ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوا سائنس سے گریجویشن کرنے کے باوجود اردو ادب سے ایم اے کیا۔ شاعری وراثت میں ملی (شعر نہیں) ذوقِ شاعری کی چھکاری کو ماحول کی ہوائے شعلہ بنادیا اور کم عمری سے ہی شاعری پر شباب آنے لگا۔ اپریل ۱۹۸۵ء کو والد محترم حضرت تبااں نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا تب تک میں ان ہی کے سایہ شاد گردی میں تھا۔ والد صاحب کی شاگردی کے بعد

حضرت سید نظیر علی مدیل کے آگے زانو سے ادب تہہ کئے اور انھیں انتقال تک انہی کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل رہا حضرت مدیل فین عرفان پر یدِ طولیٰ رکھتے تھے پُر گوئی و استادِ سفر تھے صفتی مرحوم سے لے کر حضرت مدیل کی غایبانہ اور حاضرانہ صحبت کا فیض ہے اسی لیے ۱۲ سال کے عرصہ میں تین مجموعے ہائے کلام شائع کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے نثری مجموعے زیر ترتیب ہیں افسانے ڈرامے سنجیدہ مضامین مزاحیہ مضامین انٹرویوز وغیرہ کی اشاعت زیرِ غور ہے۔

حیدر آباد فرخندہ بنیاد کو جس کی بنیاد شاعر و عاشقِ بادشاہ قلی قطب شاہ نے ڈالی تھی، شاعروں اور شاعروں کا شہر کہا جائے تو بے جا ہوگا۔ مہینے میں اوسطاً چھ شاعر ہوا کرتے ہیں اور زیادہ تر طرحی جس کے باعث نئی غزلوں میں خوشگوار اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ۱۹۶۶ء سے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری کا آغاز ہوا اب شاعری سن بلوغ کو پہنچ گئی ملک اور بیرون ملک کے تقریباً رسائل میں میرا کلام شائع ہونے لگا شہر اور بیرون شہر کے شاعروں میں کلام کو پسند کیا جانے لگا دور درشن اور آل انڈیا ریڈیو سے کلام کے ساتھ ساتھ نام کی تشہیر بھی ہونے لگی۔

ادارۂ ادبستان دکن بہ یادگار حضرت صفتی اور نگ آبادی (جس کے بانی میر سوادہ حضرت تانیاں تھے) کا معتد عومی ہوں صدر جناب نذر الدین خاں کی رہنمائی میں اس ادارہ کی حیثیت سے حضرت صفتی اور نگ آبادی کے کلام اور ان کی شخصیت پر بہت کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے ”گلزارِ صفتی“ کی اشاعت اور سماج عمری حضرت صفتی اور نگ آبادی کی مصنف نواب نذر الدین خاں کے علاوہ جناب محبوب علی خاں انھار کی کتاب ”تلاذ صفتی اور نگ آبادی“ ادارہ کے سلسلہ مطبوعات میں سے ہے جنھیں پڑھ کر حضرت صفتی کی زندگی کے تمام پہلو روشن نظر آتے ہیں۔ اصلاحاتِ صفتی کے عنوان سے والد مرحوم نے تقریباً تیس سال قبل ”طلبِ میں“ شاگردوں کے کلام پر حضرت صفتی کی اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا تھا جناب انھار نے اپنی کاوشوں سے اصلاحاتِ صفتی کو مکمل کر کے شائع فرمایا۔ بہر حال ”ادبستان دکن“ دکن کے شعراء کے نام اور کلام کو باقی رکھنے کا جو بیڑہ اٹھا رکھا ہے اس کو میں اپنا اعزاز سمجھتا ہوں

پاسبانِ ادب کا بھی معتد محو ہوں۔ ”بساطِ دل“ میں مرحوم نقاد، شاعر جناب عزیز قیسی نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا نیز ڈاکٹر سیدہ جعفر اور جناب احمد جلیس نے اپنے ذہن خیالات سے میری ہمت افزائی کی تھی نیز اُس پر تبصروں کا ایک خوشگوار سلسلہ جاری رہا پھر خدا خیر کرے پر ملک کے ممتاز ادیب جناب مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر مجید بیدار، ممتاز شعراء، ساعر خیامی رضا نقوی و اہی اور دوسروں نے میرے کلام کو سراہا اور اتنی ہمت افزائی کی کہ ”نشاطِ الم“ آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔

میں اس مجموعہ کی اشاعت میں تعاون کرنے والوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا بے حد ممنون ہوں کہ وہ ادبی، سیاسی، سرکاری اور خانگی مصروفیات سے وقت نکال کر میرے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار کیا مجھے خوشی ہے کہ اُنھوں نے ”بساطِ دل“ اور خدا خیر کرے کو بھی اپنے ساتھ رکھ کر میرے کلام کا جائزہ لیا۔

میں اپنے استاد محترم حضرت سید نظیر علی عدیل مرحوم کا بھی ممنون ہوں کہ اُنھوں نے نہ صرف میرے کلام پر اصلاح دی بلکہ اپنے تاثرات سے میری ہمت افزائی فرمائی۔

میں شکوہ ہوں ان تمام اصحاب اہل اداروں کا جنھوں نے میری ہمت افزائی فرمائی کہ یہاں

اس قابلِ بنا کہ میرا تفسیر مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے والد مرحوم شمس الدین تاجاں استاد محترم

سید نظیر علی عدیل مرحوم کی دعائیں بھی شامل رہیں نیز کتاب کی اشاعت میں آئندہ سرپریش

اردو اکیڈمی کے جزدی مالی تعاون کا بھی دخل ہے جناب حسن چشتی کا بھی میں شکوہ ہوں جنھوں نے

میری شاعری کو بین الاقوامی شہرت عطا کرنے میں اپنا تعاون دیا۔ جناب نذر الدین خان جناب وحی

قادری اور جناب مفطر مجاز کے مشوروں کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جناب محبوب علی خاں خگر

نے کتابت طباعت میں جو بے لوث خدمت کی اس کے لیے ان کا شکر گزار ہوں۔

امید کہ قارئین میری اس کوشش کی ستائش نہ بھی کریں تو ہمت شکنی نہیں کریں گے۔

رؤف رحیم

پھر کربِ انبساط کو ٹھکرا چکا ہوں میں
تو بھی اب نشاطِ الم سا تھکے نہ دے

(منظرِ حجاز)

”رُفُوحِ رَحِيمِ کی شاعری“

جناب محمد رُفُوحِ رَحِيمِ الدِّین المعروف رُفُوحِ رَحِيمِ میرے ہم محلد بزرگ دوست جناب شمس الدین تآبآل کے فرزند اور چشم و چراغ ہیں۔ برہنہ روالہ باقدیم انہیں میں ان کے لڑکپن سے جانتا ہوں اور ان کی شعری صلاحیتوں کا رمزا آشنا ہوں جناب تآبآل دکن کے بہت اچھے شاعر اور استاد سخن صوفی اور رنگ آبادی کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ شعر و سخن کے دلدادہ ان کے حلقہ احباب میں تھے شاعروں کے تذکرے اور شعر و شاعری کے چرچے گھر میں چلتے رہتے۔ ایسے ماحول میں جناب تآبآل کے دونوں فرزند سچی جہل اور رُفُوحِ رَحِيمِ ملی کر جوان ہوئے اور پھر زمینی تربیت کی نشوونما۔ شاعرانہ حس کو متحرک کرنے اور صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں جناب تآبآل کا فیضانِ نظر کا فرما رہا اس فیضِ رسانی کا اثر اور طفیل ہے کہ دونوں بھائی شاعر ہیں اور دائرِ سخنوری دے رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جناب رُفُوحِ رَحِيمِ کو شعر و ادب کی بڑی اچھی صلاحیتیں قسامِ ازل نے عطا کی ہیں اور خود انھوں نے اپنے ذاتی ذوق و شوق بے پناہ دلچسپی لگی اور جستجو سے مشغلہ شعر و شاعری کو اپنایا۔ آج وہ ایک اچھے اور منفرد انداز کے شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور معروف ہیں۔

اس جوان سال شاعر کی طبعیت کا بھی عجیب الٹکھا پن ہے جس کے ذہن و فکر کا دنیا میں غم اور خوشی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ اجتماعِ ضدین ان کی شخصیت کا نمایاں وصف ہے سنجیدہ نظم و نثر اور مزاحیہ نظم و نثر لکھنے میں انہیں بڑی مہارت ہے۔ اس فن کو اس خوبی سے نبھاتے ہیں کہ ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انہیں سنجیدہ نگار کہیں یا مزاحیہ نگار۔ طرعی مشاعروں میں طرح پر سنجیدہ اور مزاحیہ غزل دونوں میں طبع آزمائی کمرے

رؤف رحیم میری نظر میں

جناب رؤف رحیم کا شمار حیدرآباد کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے! اپنی اوائل عمری سے شعر کہتے ہیں جس کے باعث ان کے تین مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں طنز و مزاح اور سنجیدہ ادب دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں طبیعت میں انکار اُفغیں ورشہ میں ملا ہے حضرت شمس الدین تائبال کے فرزند ہیں ان کی تعلیم اور خصوصاً تربیت نے ان کے کلام کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو بھی نکھارا ہے بزرگوں سے ہودیانہ ملتے ہیں اور اپنے ہمعصوروں سے خندہ پیشانی کے ساتھ۔ انکار میں خود داری کا دامن نہیں چھوڑتے۔ گرد پ بندی کے خلاف ان کا جہاد جاری رہتا ہے تمام مکاتیب خیال کے شعراء کو اپنے جائز مقام دلانے کے خواہاں رہتے ہیں۔ نشاطِ الم ان کے سنجیدہ کلام کا مجموعہ ہے کلام میں بختگی، بے ساختگی اور تمام فنی لوازمات موجود ہیں جس پر حضرت تائبال سے لے کر حضرت صفی اورنگ آباد کا پر تو نظر آتا ہے زبان شائستہ اور خیالات پاکیزہ ہیں۔

اردو ادب میں بہت کم شعراء ہیں جو طنز و مزاح اور سنجیدہ شاعری پر یکساں دست رکھتے ہوں۔ جناب رؤف رحیم بہت لکھتے ہیں بہت سے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے ہیں تمام شعراء سے ربط اور ان کے کام کرنے کے جذبہ کی باعث ہر لحاظ سے شاعری کے علاوہ نثر نگاری کا بھی شغف ہے۔ افسانے ڈرائے، انٹرویوز اور مضامین کا ایک کثیر ذخیرہ موجود ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کا زیر نظر مجموعہ عوام میں مقبول ہوگا اور ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام حاصل کرے گا۔

محبوب علی خاں اختر قادری

نصیب شمس جہاں نائجا آباد

تباہی مقصود ہے کہ یہ غزل کی رومانی فضاء ہے۔

لیکن غزل نے کئی منزل طے کئے اور اب بھی مائل یہ ارتقاء ہے ایسے ہی جب نے سماج کے ارتقاء کے ساتھ کئی۔۔۔ بنا زل طے کیئے۔ غزل ابتداء میں صرف معشوق ہے چیت (بلکہ چھپر چھاڑ) اور رقیب سے لڑک جھونک سے عبارت تھی اور یہ خصوصیت اب بھی باقی ہے پھر اس میں ابتذال آیا۔ مواد سے زیادہ بیان پر توجہ مرکوز ہو گئی۔ گو یہ دلہن ہے زیادہ جہیز پر نظر پڑنے لگی۔ پھر عورت ایک کھلونا بن گئی اور غزل ”تھکے ہوئے“، ”وابالہا کے لیے“ ”حب سلاجیت“ کا کام کرنے لگی۔

پھر نشاۃ ثانیہ اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ساتھ غزل نے بھی انگڑائی لی۔ حسرت موہانی کے ہاتھوں پھر سے پاکیزگی حاصل کر لی اور اب غم جاناں کے ساتھ صاف کبھی اشارتاً اور کبھی براہ راست انداز میں ”غم دوراں“ اس کا مواد بن گیا اب محبت کے دائرے وسیع ہوتے چلے گئے شاعر معشوق کی یاد میں کھویا کھویا سا جا رہا تھا کہ راہ میں ٹھوکر لگی اور یہ ایک مفلوک الحال انسان کی لاش تھی شاعر کو جھٹکا سا لگا۔ رحیم نے ”بساطِ دل“ میں کہا ہے

خون سے سینچتے ہیں کھیتوں کو : حتی نہیں جن کا چار دالوں پر !

اب عشق کی منزلیں ہو گئیں۔ ذوق کے نزدیک وہ اپنی انتہا پر پہنچ کر شعور تحت الشعور اور لاشعور کے مابین رابطہ بن جاتا ہے یعنی حقیقت موجود اس سے نا اُ سودگی کا احساس اور پھر حصول آسودگی کی خواہش کر دیں لینے لگتی ہے۔ ”عشق نے شاعر کو موم صفت بنا دیا۔ اب وہ غم دوراں“ کو اپنا غم سمجھنے لگا۔ پہلے شاعری عشق مجازی سے شروع ہو کر عشق حقیقی پر ختم ہوتی تھی اور اب غم ذات سے شروع ہو کر غم کائنات کو اپنے اندر سمیٹ کر نئی خوشیوں کی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔ بقول فیض شاعر کا کام قطروں میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دوسروں کو دکھانا بھی ہے اور پھر اپنے شعور اور حوصلے کے مطابق دجلہ کے بہاؤ کو سماجی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنا ہے۔

”نشاطِ اُم“ ہی دیکھ ڈالے آپ کو ٹھیک رومانی غزل کے اشار میں گے۔

اُن کا نظریں جھکا کے چُپ ہونا : سو سوالوں کا اک جواب ہوا
اور یہ شعر ہے

زُلف ہے رُخسار پر چھپائی ہوئی : دن تصدق ہے تمہاری شام پر
چھریہ شعر ہے

بادلِ سمندر دل پہ برس کر چلے گئے... : جیسی کی ویسی رہ گئی چھ جھگولوں کی ایک
اس شعر کو جتنی بار پڑھیے معنوں کی تمہیں کھلتی جائیں گی۔ بادل کو اسی جگہ برساتا تھا جہاں بکتر
پانی پیلے ہی سے موجود ہے جھگولوں کی طرف توجہ نہیں کی یہاں نہ صرف درختوں کو اس کی ضرورت
ہے بلکہ ان ہی جھگولوں میں ایک صحرا لُرد "عاشق" مجنوں بھی پیسا سا ہے اور اس کا حلق تر نہ ہوا
یہ بادلوں کی تنگ دامن بھی ہے اور عاشق صادق مجنوں کی محرومی بھی سوچئے تو عمری سماج
کی نا انصافی کی طرف اشارہ بھی ہے غزل کا یہ شعر دیکھیے۔

پالیا میں نے وفاؤں کا جواب : خط میں ان کے پھول تھا سو کھا ہوا
خط لکھا۔ اس میں حجت اور عقیدت کا پھول رکھا۔ پھر خط بھیجنے میں تاخیر کی طرف اشارہ
دیکھیے "خط بھیجوں نہ بھیجوں؟" کا تذبذب ملاحظہ کیجئے۔ پھول سوکھ گیا۔ لیکن میں ان
کی "وفاؤں" کا ثبوت بھی ہے عشق تو ہے لیکن اظہار کی جرأت شاید کم ہے۔ دل و ذہن کمی
ادبِ رش نے کیا حال بنا رکھا ہے؟

رحیم کے اطراف و اکناف کرب بھی تو ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

کس لیے منڈلا رہے ہیں گدھے یہاں : کیا کوئی بھوکا مرا ہے شہر میں
اور یہ شعر شعر نہیں سماج کے ناسور پر نشتر ہے۔

گسٹوں کو سلاتے ہیں وہ بسترِ سیاہ : مفلس کو جو دہلیز پہ سونے نہیں دیتے
کشتی میں بیچھے کر سمندر پار کر جانا سمندر کو دیکھنا اور پر کھنا نہیں ہے موجوں کے اتار چڑھاؤ
کے ساتھ بہ جانا بھی سمندر کی گہرائی کا پتہ نہیں دیتا۔ سمندر زندگی کی علامت ہے۔
گہرائی میں موجوں کی اُتر کر نہیں دیکھا : کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا
فراق نے کہا ہے۔

انسان نے خدا کو جب بنایا تو فرات : پکار اٹھا کہ خدا نے مجھے بنایا ہے
اب رحیم کو سنیے اسی راستے پر کامزن معلوم ہوتا ہے۔

اس سے دنیا وجود میں آئی : آدمی وجہ انقلاب ہوا !
ابج کے انسان میں شق البشر کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے وہ سماج سے کٹ رہا ہے بکھر رہا ہے
اس کی زندگی اس کے ارمانوں کا منار بنی ہوئی ہے وہ ایک ٹوٹا ہوا آئینہ ہے جس میں چہرہ بکھ
ہوا اور مسخ ہی نظر آئے گا۔

اپنا چہرہ مجھ میں دیکھے کیوں کوئی؟ آئینہ ہوں ٹوٹ کر بکھر رہا ہوا
کیا انسان مجبوری ہے یا مختار بھی؟

کوئی سمجھ نہ پایا کہ انسان اصل میں مجبور زندگی ہے کہ مختار زندگی
پھر رحیم اس تذبذب کی حالت میں بہت دیر نہیں رہتا

رو منزل میں بڑھتا ہے رحیم اک شیعہ مرداں

وگرہ لوٹ کر گھر کو تو اک اندھا بھی آتا ہے

اور رحیم جینے کے لیے یا جہاد حیات میں حوصلے کہاں سے حاصل کرتا ہے؟

اب غم عشق کی دولت سے توازن لے لے مالک

غم دوراں سے تو بیروں کی شناسائی ہے

”غم دوراں“ سے برسوں کی شناسائی ہے سوال اس سے آویزش کے چیلنج کو قبول کرنا ہے
اور ”غم عشق“ ہی سے رحیم حوصلہ حاصل کرتا ہے یہاں غم عشق اور غم دوراں کا ربط بھی واضح
ہو جاتا ہے۔ ”ماہتاب“ کے فریب میں ہمارا شاعر ازل سے مبتلا رہا ہے۔ ایک نشاط نامعلوم کا
احساس ماہ کامل سے ہوتا ہے وہی معشوق تھا اور اسی کی چاندنی سے ایک طرف سمندر کی موجیں
ٹٹاٹھیں مارتی تھیں تو دوسری طرف جنوں عشق بھی تیز ہوتا تھا۔ لیکن۔

جب سے تسخیر ماہتاب ہوئی سپح نظروں میں ماہتاب ہوا

فریب ٹوٹا۔ نشاط نامعلوم غائب ہوا۔ سمندر کی موجیں اب خاموش ہیں عشق میں جوار بھاٹا اب
نہیں ہوتا آؤ تو طلسم بھی زندہ رہنے کے لیے ضرور ہے۔

”انا“ رحیم کا خالی موضوع معلوم ہوتا ہے۔ دیکھئے۔

اچھی ہے رحیم اتنی لازم ہے آنا جتنی
بٹھ جائے اگر حد سے پستی میں گرا دے گی
حصارِ ذات سے باہر نکل نہیں سکتا
اسیرِ زلفِ آنا ہے وہ پارِ سائب سے
آدمی سانپ بن کے ڈس لے گا
حد سے آگے انا نکلتے ہی
عصری حقیقتوں کی تلخی کو کیسے پیش کیا ہے؟

کیا باغباں نے یہ گلشن کا عالم
نہ پھولوں میں خوشبو نہ ہی تازگی ہے
ہماری طبیعت میں جو رعبی ہے
یہ بے حس زمانے سے ہم کو ملی ہے
لگایا ہو چہرے پہ چہرہ نہ اس نے
وہ رہزن ہے یا راہ بردیکھئے گا
انجامِ گلوں کا انھیں جب سے نظر آیا
حساس لگا ہوں نے گلِ تر نہیں دیکھا
قتل بھی ہم ہی ہوئے قاتل بھی ٹھہرائے گئے
جبرِ مانِ وقت ہی ہم کو سزا دینے لگے
دھوپ سایہ اور شجر کا اعجاز دیکھنا ہو تو رحیم کے یہ شعر دیکھئے۔

دھوپ ڈھل جائے تو پھر سایہ کہاں
دھوپ سایے کو اٹھالے جائے گی
یہ علامت کہ سورج ہے تنزل کی طرف
اپنے قد سے جو بڑا ہو گیا سایہ اپنا
کڑی دھوپ سہہ کر بھی دیتا ہے سایہ
ہے بے لوث کتنا شجر دیکھئے گا
چاند تو بھیک کا نور اور مانگے کے اُجالے میں گمن ہے لیکن چاند سورج ہی سے تو بھیک کی ہی
روشنی لے کر اس میں اپنے دل کی ٹھنڈک بھر دیتا ہے اور ہمیں خوشگوار چاندنی نصیب ہوتی ہے
”روشنی“ کی اس کا یا کلب کو سورج کی گری سے چاندنی کی ٹھنڈک تک بدل جانے کے راز کو سمجھنے
کے لیے رحیم کو سنیئے۔

سورج کی روشنی جو تھریک نہ آئے گی
پھر چاندنی کسی کے بھی گھڑک نہ آئے گی
ایک پُرانا خیال ہے جو ضربِ المثل بن گیا ہے۔ رحیم کو سنیئے۔

غیروں کی آنکھ کا ہمیں تینکا دکھائی دے
مشکل ہے اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھنا
آج ملک جن ”دھاکوں“ سے گزر رہا ہے وہ رحیم کے اشعار کا جُز بن چکے ہیں سنیئے۔
کٹ رہے ہو، سہ سال فصلوا، اکرماند آجکل، مارا مارا، دلشاکر، اکو دھاتی ٹڑا، از رخ سے

یہ دور دھماکو ہے اسی واسطے اس وقت
 ہم بچوں کے ہاتھوں میں کھلونے نہیں دیتے
 یوں دھماکے ہو گئے معمول اپنے ملک میں
 اب پٹنہ بھی ہمارا دل ہلا دینے لگے
 لگانے والے مرے گھر کو آگ سوچ آنا
 لگا ہوا مرے گھر سے ہی خود تر گھر ہے
 اس بار خاک ہو گئے بستی کے سارے گھر
 ملتا نہیں ہے اپنے ہی گھر کا بیتہ مجھے
 میں جانتے ہوئے قتال کو ہوں جو مہربان
 اسی سے خون کا رشتہ ہے کیا کیا جائے؟
 مسجدیں ٹوٹ کر بندریں ٹوٹ کر اینٹ پتھر سے بن جائیں گے پھر، مسکرا
 ان دلوں کا تباہ کر کیا حال ہو جو فسادوں میں ٹوٹے ہوئے رہ گئے!
 کبھی خلوص کی شمعیں جلائی جاتی تھیں
 ہمارے شہر میں اب گھر جلا جاتے ہیں
 مناظر دیکھ کے جلتے گھروں کے
 نظر ڈرنے لگی ہے روشنی سے
 یہ تو رحیم کے شعری مجموعے ”نشاطِ الم“ کا صرف ایک تعارف تھا اس کے آگے وسیع امکانات
 ہیں خود وہ کہتا ہے۔

دیکھنا ہے آگے آگے کیا قیامت ڈھائے گی
 یہ عرصہ شاعری میری ابھی نو خیز ہے

راج بہادر گروڑ

حیدرآباد۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۳ء

مناشرات

رؤف رحیم اردو کے اُن شاعروں میں شامل ہیں جو صرف اپنے لیے شاعری نہیں کرتے بلکہ اُن کا نگاہ میں شاعری کا ایک سماجی مصرف و منصب بھی ہے اس لیے رؤف رحیم کی غزلیں رسائل کی زینت بھی بنتی رہتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے تخلیقی تجربوں میں دوسروں کو شرکت کا موقع بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

روایت کے صدف پر تہذیب کے تکلف کی روشنی پڑتی ہے تو اُجالا ساد دکھائی دیتا ہے۔ رؤف رحیم کی شاعری اسی اُجالے کی شاعری ہے۔ یہ اُجالا اُن کی شاعری پُرخیط ہے۔ شاعر جید آباد جیسے علم دوست، مہذب اور تصوف اثر شہر کا پروردہ ہے اسی لیے ان کی شاعری کے چہرے پر یہ رنگ ہونا بھی چاہیے انھوں نے اپنے نوزدیں جذبات اور خوش رنگ خیالات کو شاعری کی اس زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو صدیوں کی شاہکی کے بعد ورثہ کے طور پر ہمیں ملی ہے۔

مجھے امید ہے کہ موصوف کا یہ نیا مجموعہ کلام ”بساطِ دل“ کے مقابل میں تمنا کا دوسرا قدم ہوگا۔ میں مسرت و مسرتہ کو رین ہنسا کا مضمون ہوں کہ مجھے موصوف کی وساطت سے رؤف رحیم کی شاعری کی یکجا طور پر پڑھنے کا موقع ملا۔

پروفیسر عنوانِ چشتی

سربراہ شعبہٴ انسانیات و لسانیات
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

رؤف رحیم حیدر آباد کے شعری و ادبی حلقوں میں معروف بھی ہیں اور مقبول بھی وہ بہ یک وقت سنجیدہ شاعری بھی کرتے ہیں اور مزاحیہ بھی۔ یہ بات خود ان کی شعری صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔ ایسے بہت کم شاعر ہوتے ہیں جو سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری میں یکساں طور اعتبار پیدا کر سکیں۔ یہ رحیم کا کارنامہ ہے کہ وہ آج دلائل مثبتوں سے اپنا ایک مقام رکھتے ہیں ان کے مزاحیہ کلام کا مجموعہ ”خدا خیر کرے“ مقبولیت اور پسندیدگی کی سند حاصل کر چکا ہے۔ سنجیدہ شاعری میں اپنے پہلے مجموعے کلام ”بساطِ دل“ کی وجہ سے وہ معروف ہو چکے ہیں اب ان کا تیسرا مجموعہ ”نشاط الم“ منظر عام پر آ رہا ہے ”بساطِ دل“ پر ”نشاط الم“ کی بانی لگانا ان کی شاعرانہ خود اعتمادی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کو شاعری سے فطری اور جذباتی لگاؤ ہے بلکہ ان کو پیدائشی شاعر بھی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ ان کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ وہ حیدر آباد کے بہت ہی معروف شاعر جناب شمس الدین تانیال مرحوم کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ اس سارے شعری پس منظر کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کا نیا شعری مجموعہ ”نشاط الم“ نہ صرف ادبی حلقوں میں با محفل ہاتھ لیا جائے گا بلکہ ان کے شعری مقام کو بلند تر بھی بنائے گا۔

پروفیسر یوسف سرمست

”گنگان“ بنجارہ ہلز

سابقہ مد شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

حضرت سید نظیر علی عدیل



کہتے ہیں کہ میر و غالب کے زمانے میں گلی گلی شعر و ادب کا چرچا تھا لیکن ادبی تاریخوں کے فٹ نوٹ میں بھی ان شعراء کی پرچائیں نہیں دکھائی دیتی جو بہ زعم خود میر و غالب کو آئینہ دکھانے کا خط لکھتے تھے البتہ ایسے شاعر جنہوں نے میر و غالب کے آئینوں کی جوت سے اپنے نگار خانہ فکر کے لیے جلا حاصل کی وہ نہ صرف زمانے میں پیچھے بلکہ ادبی تاریخوں کے ناسوں کی دھمک بھی سنائی دیتی ہے یہی صورت حال آج بھی درپیش ہے اچھی شاعری اور اچھے شاعر دل کو مبرا بھلا کہنے والے ہزاروں نظر آئیں گے لیکن ٹٹولو تو جسما ایک بھی موجود نہیں ملے گا۔ ہاں وہ شاعر جنہوں نے کلاسیکی شاعری سے ایسی شعاعوں کا اکتساب کیا جو کبھی ماند ہی نہیں پڑتیں بلکہ ہر دور میں جگمگاتی رہتی ہیں اور شعر و ادب کے بیشتر سنجیدہ اور معتبر تاریخین کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اپنی ایک الگ تاریخ رکھتے ہیں اور آئے دن اس میں اضافے ہی کے جارہے ہیں۔ ایسے ہی معدودے چند شعراء میں روف رحیم کا بھی شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنے عہد کی معنی انجیری اور فکری اور فنی رجحانات کے سفر کی پہلی منزل پر مدے پھیلنے کے باوجود اپنی راہ کو ہموار بنالیا اور اس پر آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ شاعر اس لیے شعر کہتا ہے کہ وہ شعر کہنے پر مجبور ہے ہر تخلیقی فکر پر اس کے اضطراب، اس کی روحانی سک، اس کی خود رفتگی اور الجھن کا جبر ہوتا ہے اور یہی جبر اس کو اظہار کی راہ پر لگاتا ہے اس کے علاوہ عصری مزاج کی ناپائیدگی کے لیے جس شعور کی ضرورت ہوتی ہے وہ مسلسل مشق صحیح رہنمائی اور بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے روف رحیم نے وہ شعور اس عمر میں حاصل کر لیا جسے حاصل کرنے کے لیے ابھی کچھ اور عمر درکار تھی اس کی بھی چند جہ وہ ہیں پہلی تو یہ کہ انھوں نے مرحوم شمس الدین تاباں کے فرزند ہونے کے ناطے شاعری ورثے میں پائی دوسری وجہ ان کا مطالعہ اور مطالعہ سے اکتساب کی صلاحیت ہے تیسری اور آخری وجہ یہ ہے کہ اس میدان میں ان کی رہنمائی ایسی شخصیتوں نے کی جن سے وہ مطمئن ہو سکتے تھے۔ اس طرف سے آسودہ ہونے کے بعد وہ شاعری کی نئی جہتوں کی طرف لگ گئے

نیتجے کے طور پر ان کی فکر کا عفر گہرا اور مضبوط ہوتا چلا گیا اور اب ان کی شاعری ٹھٹھ
احساس کی زبان ہے جو فکرِ زیریں لہر کی صورت میں کارفرما ہے۔

اس سے قبل رؤف رحیم کے دو شعری مجموعے ”بساطِ دل“ اور ”خدا خیر کرے“ شائع
ہو چکے ہیں جو علی الترتیب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ حکومت اتر پردیش اور
اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے جزوی تعاون سے شائع ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ ”نشاطِ
الم“ کی اشاعت میں بھی امکان ہے کہ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا جزوی اعانت
شامل رہے گی پہلے دونوں مجموعے کافی مقبول ہوئے اور بالحقول ہاتھ پک گئے۔ لہٰذا
اس مجموعہ کلام سے بھی ویسی ہی توقعات وابستہ کی جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

میں نے اس مضمون میں رؤف رحیم کے کچھ شعر نمونے کے طور پر اس لیے درج نہیں
کئے کہ جناب ڈاکٹر لاج بہادر گوڑ نے ان کے کافی اشعار دلچسپ وضاحت کے ساتھ نذرِ قارئین
کر دیئے ہیں۔

منظورہ

سید ظفر علی عدیل

حکایت

ہے جو وظیفہ مرا لا الہ الا اللہ
 ہر اک مرض کی دوا لا الہ الا اللہ
 ہوا جو گونجی تھی پہلی نبیؐ کے کانوں میں
 یہی تھی ایک ندا لا الہ الا اللہ
 یہی وظیفہ آعظم ہے سب وظیفوں میں
 رہے رہاں پہ ندا لا الہ الا اللہ
 رہے گی نیکر اُسے دین کی نہ دنیا کی
 کہ جس نے دل سے کہا لا الہ الا اللہ
 شجرِ حجرِ یہ زمیں آسماں سمندر سب
 پکارتے ہیں ندا لا الہ الا اللہ
 ہزار کفر نے کی کوشش مٹانے کی
 دلوں سے مٹ نہ سکا لا الہ الا اللہ
 رہے گی موت بھی آسان اس بشر کی حتم
 زباں چس کی رہا لا الہ الا اللہ

مناجات

شمعِ ایمان کی مرے دل میں جلادے یارب
 دل کی اجڑی ہوئی بستی کو بسادے یارب
 جو مرے پاس ہے کر دوں گا وہ قرباں تجھ پر
 لڑکھڑائی گے نہیں میرے ارادے یارب
 روزِ محشر مجھے غیروں میں تو شرمندہ نہ کر
 تو ہے ستارِ مرے عیب چھپا دے یارب
 تیرے ہاتھوں کا کھلونا ہے یہ دنیا ساری
 تیری مرضی ہے بسادے کہ مٹا دے یارب
 پاک ہو جاؤں گا میں چُوم کے سنگِ اسود
 مسکے جانے کے کچھ اسباب بنادے یارب
 تیرے محبوب کی اُمت میں ہیں ہم سب شامل
 کیسے ممکن ہے کہ تو ہم بھولادے یارب
 یاد میں تیری تڑپتا ہے شب و روزِ حسیم
 کسی صورت سے اُسے جلوہ در کھادے یارب

نعتِ اقدس

جب دل کو ہم نے یادِ نبیؐ سے سجایا
 ایسا لگا کہ مقصدِ کونینِ پالیا
 اک چاندنی سی رُوح میں میری اُتر گئی
 آنکھوں میں جب گنبدِ خضر اُلسا لیا
 اللہ بھی تو آپؐ کا مُشتاقِ دید تھا
 عرشِ بریں پہ اس لیے اُن کو بُلا لیا
 وہ آئینہ تھا یا کہ کوئی عکسِ آئینہ
 معراج کا ہے واقعہ اب تک سوالیہ
 ثابت ہوا کہ آپؐ کی تابع ہے کائنات
 سورج کو اک اشاکے سے واپس بُلا لیا
 جس کے اثر سے کوہ بھی ہو جاتے پاش پاش
 سرکار نے وہ ہارِ نبوت اُٹھ لیا
 ہے بخششِ رحیم بھی نسبت سے آپؐ کی
 ہے مطہرین کہ آپؐ کے دامن کو پالیا

نعت

جلنے سے عیاں اے دل والو! انزل کی اُلفت ہوتی ہے
 آجاؤ کہ روشن محفل میں اب شمع رسالت ہو تی ہے
 سرکار کی سنت پر چل کر تکمیل شریعت ہوتی ہے
 اس واسطے اُمت کی اُمت وارفتہ سنت ہوتی ہے
 جب لب پہ وہ نام آجاتا ہے بے چین طبیعت ہوتی ہے
 پھر شکے وال ہو جاتے ہیں آنکھوں کی طہارت ہوتی ہے
 جانے کو مدینہ جاتے ہیں سب لوگ زیارت کرنے کو
 مرجائیں مدینہ میں جا کر یہ آخری حسرت ہوتی ہے
 نادم ہیں گناہوں پر عا می لیکن یہ یقین بھی رکھتے ہیں
 گراں کا وسیلہ مل جائے بے شہ شفاعت ہوتی ہے
 کیوں کر نہ بڑے ہوں رتبے میں اللہ کے سارے نبیوں سے
 سرکارِ دو عالم پر حق سے جب ختم نبوت ہوتی ہے
 ممکن ہے جہاں تک نعت لکھو شش ہے اگر مقصودِ حرم
 چارہ ہی نہیں کچھ اس کے سوا بس اک یہی صورت ہوتی ہے

سلام

ہم اُن کو یاد بصدِ احترام کرتے ہیں
 حسینؑ ابنِ علیؑ کو سلام کرتے ہیں
 شہید مَرتے نہیں ہیں کبھی زمانے میں
 زمیں پہ رہ کے فلک پر قیام کرتے ہیں
 حسینؑ ان کے نواسے ہیں ان کے نختِ جگر
 کہ جن کے حکم سے کس کر کلام کرتے ہیں
 وہاں پلائی گئے کوثر کے جامِ ان کو نبیؐ !
 یہاں جو نوشِ شہادت کے جام کرتے ہیں
 یہ ایسا غم ہے کہ دل سے مٹا نہ سکے
 غمِ حسینؑ تو ہم گامِ گام کرتے ہیں
 ہم ان کی یاد مناتے ہیں اس لیے دل سے
 پیامِ اُن کا جو تھا اس کو غام کرتے ہیں
 جہاں بھی سبطِ محمدؐ کا تذکرہ ہو حسیم
 وہاں اُتر کے فرشتے قیام کرتے ہیں

منقبتِ غوثِ پاکؒ

مسلم اولیاء میں ہے بڑائی غوثِ اعظم کی
”خدا ہے غوثِ اعظم کا خدائی غوثِ اعظم کی“

میں ٹھکرا کر جہاں کی نعمتیں پالوں درِ اقدس
شہنشاہی سے بڑھ کر ہے گدائی غوثِ اعظم کی

مشرق ہو گئے اسلام سے ڈاکو جو کافر سے
اثر انداز تھی ان پر سچائی غوثِ اعظم کی

محی الدین تھے وہ کر گئے پھر دین کو زندہ
کرامت یہ تو تھی اک ابتدائی غوثِ اعظم کی

وہ محبوب الہی ہیں وہ پیرو کارِ احمد ہیں
زمانے پہ ہے روشن یار سائی غوثِ اعظم کی

مہک اٹھی فضائیں اور ہوئی ہے نور کی یارش
کھیں بھی ہم نے حفلِ جب سچائی غوثِ اعظم کی

مقامِ پاک کو سمجھا نہیں ہے نورِ حیم اب تک
نہیں آساں کچھ مدحت سرائی غوثِ اعظم کی

غزلیں

ایسے آنکھوں سے دُور خواب ہوا
 اک جزیرہ تھتا زیرِ آب ہوا
 جو بھی اس در پہ باز یاب ہوا
 دونوں عالم میں کامیاب ہوا
 ٹوٹ کر بن گیا خدا کا گھر
 خانہ دل کہاں خراب ہوا
 اُس سے دُنیا وجود میں آئی
 آدمی و جہمہ الفتلاب ہوا
 اک مکمل نصاب ہے ہمتی
 اپنا جینا تو ایک باب ہوا
 اُن کا نظریں جھکا کے چپ ہونا
 سوا سوالوں کا اک جواب ہوا
 قلب کو جس سے تھا سکونِ حسیم
 اب وہی وجہ اضطراب ہوا

آج پورا مریہ خود اس ہوا
اس کی نظروں میں انتخاب ہوا

حسن جب داخل شباب ہوا
نازش و رشک ماہتاب ہوا

جو مسلط رہے زمانوں پر
اُن کا جینا بھی اب عذاب ہوا

جو سزا چاہے دو کہ مجرم ہوں
جرمِ الفت کا ارتکاب ہوا

اک قیامت ہوئی بے دل میں
دیکھنا کون بے نقاب ہوا

موسمِ ہجر تھا گھٹائیں تھیں
اس لیے مائل شراب ہوا

اک کرنِ پا کے ذاتِ النور کی
میں تو ذرے سے آفتاب ہوا

عاصیوں پر اُٹھی نگاہِ کرم
سب سزاؤں کا سد باب ہوا

اک زمانہ ہوا خلیفانِ رحیم
جب سے وہ مائلِ عتاب ہوا

طائرُ روح نہ ہی جسم کا پنجر اپنا
 ہے کسی اور کے ہاتھوں میں یہ جینا اپنا
 انگلیوں پر مرے عیبوں کو گننے والے
 آئینے میں تو ذرا دیکھ لے چہرہ اپنا
 یہ علامت ہے کہ سورج ہے تنزل کی طرف
 اپنے قد سے جو بڑا ہو گیا سایا اپنا
 بار نے والا ہو بد ظن تو نہیں جیت اپنی
 فتح وہ ہے کہ بنے جس میں پرایا اپنا
 اپنی تقسیم ہے دنیا سے نرالی تقسیم
 حق میں اور دلوں کے کجالات کو اندھیرا اپنا
 فکرا شعار کے سانچے میں ڈھلی جاتی ہے
 فہم و دانش سے بہر حال ہے رشتہ اپنا
 دوسروں سے نہ رکھو تم کوئی امید حسیم
 آدمی بوجھ اٹھاتے ہیں خود اپنا اپنا



روح کو یاد کی نحو شبو سے معطر رکھنا
بند کونزے میں بہر حال سمندر رکھنا

عشق میں خود کو مٹائیں تو ملے گی منزل
راہِ آفت میں قدم سوچ سمجھ کر رکھنا

سب پرندوں کی دُعا میں تمہیں مل جائیں گی
اپنے آنگن میں کوئی پیر تنہا در رکھنا

ان کے احوال سے بہر حال میں رہنا واقف
ربط احباب سے اے دوست برابر رکھنا

یہی احباب کا شیوہ ہے روایت بھی یہی
آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر رکھنا

آنکھ کی راہ سے وہ دل میں چلے آئیں گے
پھول زخموں کے سہی دل کو سجا کر رکھنا

اُن سے کہیے ہمیں حدت سے بچانے کو رحیم
منتشر زلفوں کو اپنی سر محشر رکھنا

ذکر ہے یہاں اُن کا اور دل وہاں اپنا
 ربط ٹوٹنے پایا اُن سے کب کہاں اپنا
 کٹ رہا ہے ہر لمحہ بس خیالِ جاناں میں
 کیوں کہیں کہ جاتا ہے وقتِ اِیکال اپنا
 راستے کے پتھر خود راستہ بنا دیں گے
 ہو سفر میں ساتھ اپنے عزمِ گرجواں اپنا
 خوں سے جو لکھے تھے خط ہم نے نب جلا ڈالے
 دم گھٹا رہا ہے اب اُن کا ہی دھواں اپنا
 کشتیاں کنا سے تک بس خدا لگتا ہے
 فرض پورا کرتے ہیں موجِ وبادِ باں اپنا
 جب نہوشجر کوئی سایہ دار راہوں میں
 اُن کا فضل رہتا ہے بن کے سائیاں اپنا
 ہم نے عشق میں سودا کر لیا حسیم ایسا
 موسمِ بہار اُس کا موسمِ خزاں اپنا



منصف نے اپنے حق میں یہ فیصلہ دیا
مقتول ہو کے ہم نے اُسے خوں بہا دیا

مردہ دلوں کو جینے کا اک حوصلہ دیا
اقبال کی خودی نے نیا فلسفہ دیا

ترک تعلقات کے اسباب بھول جاؤ
میں نے بھی اپنے ذہن سے سب کچھ ٹھکرا دیا

ہم کو بھی حق پہ لڑنے کی طاقت نصیب ہو
موسیٰؑ کو اپنے فضل سے تو نے عصا دیا

ہم نے بساطِ دل ہی بھجادی اسی جگہ
جس جا ترے وجود نے اپنا پتا دیا

سوارِ گرہ کے منزلِ مقصود پا گئی ؛
یتیمور کو بھی چوٹی نے حوصلہ دیا

دل آئینہ ہے بال نہ آئے کبھی حسیم
یہ سوچ کر ہی وہم کو دل سے مٹا دیا



جب بھی ہمارے لب پہ ترانام آگیا
 دل کو سکون رُوح کو آرام آگیا
 ہم سوئے دشت و جانب صحرا نکل پڑے
 جُول ہی تمہاری یاد کا پیغام آگیا
 ساقی نے پہلے اوروں کو دے دی شربِ ناب
 حصّہ میں میرے ٹوٹا ہوا جام آگیا
 پلکوں پہ آنسوؤں کے ویسے جگمگا اٹھے
 یادوں کا قافلہ جو سرِ شام آگیا
 پھر عرش و فرشِ شمس و قمر ڈولنے لگے
 محفل سے اُن کی جب دلِ ناکام آگیا
 یہ کیسی چاندنی سی فضا میں بکھر گئی
 کیا بے نقاب کوئی سرِ بام آگیا
 جب بھی حریمِ عشق کی راہوں پہ چل پڑے
 بس ہم کو یادِ تیس کا انجام آگیا



آگے دریا ہے کہ صحرا نہیں دیکھا جاتا
 غمِ منزل ہو تو رستا نہیں دیکھا جاتا
 آنکھ رکھ کر بھی نظارہ نہیں دیکھا جاتا
 دل فربہ ہو تو میلا نہیں دیکھا جاتا
 اپنے چہرے پہ کئی چہرے چٹھا رکھے ہیں
 مجھ سے خود اپنا ہی چہرہ نہیں دیکھا جاتا
 آنکھ یوں ہو گئی مانوس غمِ جاناں سے
 اب کوئی خواب سُہرا نہیں دیکھا جاتا
 خود نمائی مری آنکھوں میں بسی ہے ایسے
 اب کوئی پھولتا پھولتا نہیں دیکھا جاتا
 عشق ہے ایک سفرِ سجدے میں جائزہ سو
 اس سفر میں کبھی قبلہ نہیں دیکھا جاتا
 مختصر طور کی ہے بس یہی رودادِ رحیم
 ہو اگر تیز اُجالا، نہیں دیکھا جاتا



گُندن کی طرح شخص وہ نکھر ابھی بہت تھا
 بھٹی میں جو حالات کی جھلسا ابھی بہت تھا
 ہر حال میں میں پانہ سکا نفس پہ شاہو
 دشمن تھا مگر جان سے پیارا ابھی بہت تھا
 پوچھے تو سہی قدر کوئی پانی کی ان سے
 جن تشنہ لبوں کے لیے قطرہ بھی بہت تھا
 اونچا بہت اٹھا تھا گرا کوہِ آنا سے
 خود اپنے میں میں ٹوٹ کے بکھر ابھی بہت تھا
 معنوب زمانہ ہوا، حق بات میں کہہ کر
 حالات نے سچ کہنے سے روکا ابھی بہت تھا
 یہ غم ہے کہ اس بھائی کے ہاتھوں میں لٹا ہوں
 سرمایہ جاں جس پہ لٹایا ابھی بہت تھا
 وہ ترکِ تعلق سے پشیاں ہے رحیم اب
 ممکن نہیں اُس سے تیں یہ کہنا ابھی بہت تھا



چھپانا آرزوؤں کا اگر آساں نہیں ہوتا
 تنہی کو بھی تمہاری دید کا ارماں نہیں ہوتا
 ہم اپنا دل بچا کر اس تمگر سے کہاں جائیں
 خطا جس کا کوئی بھی ناوکِ شرکاں نہیں ہوتا
 جھگڑنے سے مسائل حل نہیں ہوتے زمانے میں
 کبھی اک درد سے اک درد کا درمل نہیں ہوتا
 ملا ہے جسے ان کا غم ہمارے قلبِ مضطر کو!
 غمِ دوراں ہماری شان کے شایاں نہیں ہوتا
 عجب ہے دل کا عالم جس میں غم ہی سا عالم کے
 کروں میں لاکھ بھی کوشش مگر شاداں نہیں ہوتا
 جو ہے بیگانہ عالم وہ پتھر ہے اُسے اے دل
 غم جاناں غم دوراں غم میزداں نہیں ہوتا
 میسر ہے جو قدرت اس کو وہ لوح و قلم سے ہے
 رحیم اپنے قلم پر اس لیے نازل نہیں ہوتا



کسی بھی سانچے میں وہ شخص ڈھل نہ پائے گا
 حصارِ ذات سے جب تک نکل نہ پائے گا
 مزاجِ وقت کو جو بھی بدل نہ پائے گا
 وہ دو قدم بھی کسی رُہ پہ چل نہ پائے گا
 میں اک سمندرِ کربِ بلا ہوں دُنیا میں
 ”مرے وقار کو دریا کچل نہ پائے گا“
 میں اپنی جان سے گزر جاؤں گا خوشی پہ تری
 تو میرے ماتھے پہ اے دوست بل نہ پائے گا
 دلوں میں تفرقہ لانے کے بات تم نہ کرو
 یہ کھوٹا سکہ زمانے میں چل نہ پائے گا
 فرارِ عیش کے سماں اُسے بیسہ ہوں
 ترے بغیر مراد بل نہ پائے گا
 رُہ جنوں ہی میں منزل اُسے ملے گی حسیم
 کسی کے پیار کا مارا سنبھل نہ پائے گا



دن رات محبت میں اک کام کیا کرنا
 اُن کے ہی تصور میں دن رات رہا کرنا
 اک آنسوِ دامت کا دھودے گا گناہوں کو
 اخلاص ہے اک سجدہ کافی ہے آدا کرنا
 دُنیا کی لنگاہوں سے ڈر لگتا ہے گر تم کو
 اے جانِ تمنا تم آنکھوں میں بس کرنا!
 کہتے ہیں جسے دُنیا دشمن ہے محبت کی
 اور اس کا یہ شیوہ ہے دودل کو جدا کرنا
 نفرت کے پرندے سب ہر شاخ سے اڑ جائیں
 کہدویہ ہواؤں سے اس طرح چلا کرنا
 احساسِ تحسُّن کا خود قدیموں کو بکڑ لے گا
 سایے سے شجر کے تم بس دُور رہا کرنا
 دشمن بھی رحیم اپنا اللہ کا بندہ ہے
 مرنے کی کبھی اس کے ہرگز نہ دُعا کرنا



مری سمت بھی اک نظر دیکھئے گا
 پڑا ہوں سرِ وہ گزر دیکھئے گا
 تبسم، تکلم، ترنم غضب ہے
 کہیں لگ نہ جائے نظر دیکھئے گا
 کوئی نازِ آخر اٹھاتا ہے اتنے!
 کبھی دل میں یہ سوچ کر دیکھئے گا
 عجب پرکشش ہے وہ حُسنِ مجسم
 بڑھے تشنگی جس قدر دیکھئے گا
 کڑی دھوپ سہہ کر بھی دیتا ہے سایہ
 ہے بے لوث کتنا شجر دیکھئے گا
 محبت سے لبِ ریز ہو لمحہ لمحہ
 یہ ہے زندگی محققہ دیکھئے گا
 رحیم اپنی آنکھوں میں ان کو بکرا کر
 شب و روز شام و صبح دیکھئے گا



گھبراہی میں سوجوں کی اُتر کر نہیں دیکھا
 ”کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا“
 سیلابِ صفت ہی نہیں ہے برقِ صفت بھی
 اس واسطے میں نے اسے چھو کر نہیں دیکھا
 کیا ہو سکے اندازہ محشر اُسے جس نے
 بے مہرئی احباب کا منظر نہیں دیکھا
 انجامِ گلوں کا اُغصیں جب نظر آیا
 حساس نگاہوں نے گل تر نہیں دیکھا
 سنگن میں محبت کے کڑی دھوپ دی گئی
 اُمید کے پودے کو تن اور نہیں دیکھا
 کیا رشتہ ہے آئینے سے پتھر کا کھلے کیا
 جب زاویہ ہم نے ہی بدل کر نہیں دیکھا
 کہتے ہیں رحیم آج تجھے شاعر خوش فکر
 بت دیکھ لیا لوگوں نے بت کر نہیں دیکھا



جب جب بھی میری آنکھوں میں آنسو نظر آیا
 دنیا یہ سمجھ بیٹھی مجھے تو نظر آیا
 فی الواقعیہ حُسن کا حبابِ دہ نظر آیا
 وہ جلوۂ جاناں مجھے ہر سو نظر آیا
 ہر وقت ہی ڈنک اس کی رہی میری انا پر
 یہ نفس تو میرا مجھے بچھو نظر آیا
 فرقت میں کسی آنکھ سے گرتا ہوا آنسو
 یازیب سے ٹوٹا ہوا گھنگھر و نظر آیا
 کیا اس کی نزاکت ہے صباحت ہے نہ پوچھو
 وہ چہرہ لٹاتا ہوا خوشبو نظر آیا
 ہر ایک برابر ہے گدا ہو کہ شہنشاہ
 پس اُس کی نگاہوں میں ترازو نظر آیا
 او بھی رحیم آج کے دن عیدِ سنائیں
 دیکھو رُخ روشن کا اک ابرو نظر آیا



محبوب کو گر حق نے اُتارا نہیں ہوتا
”اللہ کی قدرت کا نظارہ نہیں ہوتا“

ہے عشق کی معراج ڈبولینا ہی خود کو
”دریائے محبت میں کِرتا رہیں ہوتا“

خود اپنی بنا لیتی ہیں راہیں کئی بسیلیں
ہر بیل کو پیڑوں کا سہارا نہیں ہوتا

اعمال لیے جاتے ہیں اس راہ پہ ہر دم کو
تقدیر کا کوئی بھی ستارا نہیں ہوتا

ہوتی ہے یہی طالبِ عقیٰ کی نشانی
بُزِ ذاتِ خدا اس کا سہارا نہیں ہوتا

اشعار مرے اتنے حسیں ہوں نہیں پاتے
گر حُسنِ مجسم کا اشارہ نہیں ہوتا

ہوتا ہے عبور جسے حق پر رحیم اس کو
احسان کسی کا بھی گوارا نہیں ہوتا



کیا سوچ کے ساتی نے پھر جام دیا ہوگا
 کیوں دستِ کرم مجھ تک دوبارہ بڑھا ہوگا
 احساس نہ ہو غم کا کچھ ایسی دوا دے دے
 بے ہوش ہی رہنے دے احسان ترا ہوگا
 میں اس لیے رہتا ہوں اس ہوش سے بیگنا
 مئے خانے سے نکلوں تو ہر زخم ہرا ہوگا
 ساتی کی عنایت کا در بند ہوا دیکھو
 مئے خانے میں رندوں کا اب حال بڑھ ہوگا
 دل میں جو سکوں ہے اب یہ تیری عنایت
 اُلفت کے سندر میں طوفان تھا ہوگا
 ہندو نہ کوئی مسلم، جب گڑا نہیں مذہب کا
 رندوں کا ہے اک مذہب کیوں شور بیا ہوگا
 وہ آج رحیم اپنی آنکھوں سے پلاتے ہیں
 ہر روز کے پینے کا انداز حبدا ہوگا





یہ تو میرے واسطے مشردہ ہوا
آج اک چہرہ ملا ہستا ہوا

مقتلوں کی طرح میرے شہر میں
ہر طرف ہے خون ہی بھپیلہ ہوا

موت ہے جامد سمندر کی طرح
زندگی دریا ہے اک بہتا ہوا

پا لیا میں نے وفاؤں کا جواب
خط میں ان کے پھول تھا سوکھا ہوا

یہ جہاں ثابت ہوا مثل سراب
ہر قدم پہ اک نیل دھوکہ ہوا

اپنا چہرہ مجھ میں دیکھے کیوں کوئی
آئینہ ہوں ٹوٹ کر بکھرا ہوا

کوئی مجھ پر کیا لکھے گا اے رحیم
میں ہوں اک کاغذ مگر بھیاں گا ہوا



خط میں حسین یاروں کی زنجیر دیکھنا
 اک مشغلہ ہے آپ کی تحریر دیکھنا
 نادم ہے مجھ سے ترکِ تعلق یہ وہ حسین
 تخریب میں بھی پہلوئے تعمیر دیکھنا
 غیروں کی آنکھ کا ہمیں تیرا دکھائی دے
 مشکل ہے اپنی آنکھ کا شبہ تیر دیکھنا
 گر ہم نہ ہوں تو کون اٹھائے گا تیرے ناز
 ہم سے ہے تیرے نام کی توقیر دیکھنا
 مظلوم پر نہ مشقِ ستم کیجئے حضور!
 آہوں میں اس گئی ہوتی ہے تاثیر دیکھنا
 پاکیزگیِ صفی کی ہی افکار میں نہیں
 تاباں کی شعرِ شعریں تنویر دیکھنا
 ہر شے میں اس کا حُسن نمایاں ہے اے ختم
 کس کس طرح سے کون سی تصویر دیکھنا

یہ سزا ہم کو ملی اُمید بر آنے کے بعد
 مر رہے ہیں لمحہ لمحہ آپ کے جانے کے بعد
 کیا گھٹا، قوسِ قزح کیا پھر اودھ کی شام کیا
 کون دیکھے گا مناظرِ زلفِ ہارنے کے بعد
 خط لکھا مجھ کو کسی نے اور وہ بے نام تھا
 نامہ بر بھی مسکرایا خط کو پہنچانے کے بعد
 تھیں بلائیں جتنی بھی وہ تلملا کر رہ گئیں
 آپ کے سایے میں اپنی زندگی لانے کے بعد
 روزِ محشر کیا بلائے ہے قیامت کیا بلا
 اس کا ہم مفہوم سمجھے تم پہ دل آنے کے بعد
 ہر کلی اب پھول بننے سے جھمکنے لگ گئی
 جان کرا ختام کیا ہے گل کا مَر جھانے کے بعد
 ہے شبِ فرقت تو اس کا شکوہ کیوں اے رجم
 صبحِ عشرت آئے گی اس شب کے ڈھل جانے کے بعد



کرو نہ ذکر کوئی اور ذکر یار کے بعد
 نہیں پسند خزانِ موسم بہار کے بعد
 پھر تو لے کے تھیلی پہ اپنی جان پھرو
 میں اس نتیجے پہ پہنچا بڑے وچار کے بعد
 بھی جس کی کاٹ کی جھنکار آسمان میں بھی
 بنی نہ پھر کوئی تلوار زوالِ فقر کے بعد
 تم اپنے آپ کو بے دست و پای کر ڈالو
 اگر کھٹکتی ہے مجبوری اختیار کے بعد
 ہمارے جسم میں خوشبوئے خروانہ ہے
 ہوئے ہیں گرچہ رعایا اکلِ قدار کے بعد
 اگر نظریں نہ کھیں گے عظمتِ اسلاف
 ذلیل و خوار ہی ہو جائیں گے قار کے بعد
 ہوں مطمئن سائیں اس آستان کو پاکِ حرم
 نہیں ہے آگے کوئی رستہ کوئے یار کے بعد



وہ زمیں کا چاند آیا جب میری دہلیز پر
 چاندنی اتری تھی دل میں روشنی دہلیز پر
 لاکھ خدشے سر اٹھاتے ہیں ہمارے ذہن میں
 جب کھڑا ہوا کے کوئی اجنبی دہلیز پر
 بے تکلف ہر بلا آتی ہے گھر میں صحن تک
 اگے رُک جاتی ہے لیکن خوشی دہلیز پر
 سر بلندی مل گئی ہے بس اُسی دہلیز سے
 سر جھکاتے ہی نہیں ہم اب کسی دہلیز پر
 ساتلوں میں حُسن کی خیرات آکر بانٹیں
 ایک مجمع لگ گیا ہے آپ کی دہلیز پر
 بند ہو جاتا ہے دروازہ مری تقدیر کا
 جب قدم رکھتا ہوں اپنائیں کسی دہلیز پر
 میرے در پر بس یہی تحریکندہ ہے حُسن
 آجے گا بھول کر سب دشمنی دہلیز پر

سرِ مٹیس ہیں ہم جیتیرے نام پر
 رشک آتا ہے ہمیں انجام پر
 ظلم اتنا اور دلِ ناسکام پر
 رحم کر کچھ بندہ بے دام پر
 پھر اسی کی آرزو کرتا ہے دل
 پھر ہنسی آئی خیالِ خام پر
 زندگی ہے موت کا نعم البدل
 اور ہم مرتے ہیں اس کے نام پر
 سانس جیسے چاہ پُاں کے پاؤں کی
 میں ٹھہر جاتا ہوں ہر ہر گام پر
 چاند کا دھوکہ نہ ہو جائے کہیں
 زلف بکھرے نہ آؤ بام پر
 امن کی تسلیم دو ٹوں ہی نے دی
 کیوں ہیں جھگڑے پھر رحیم اور ام پر



چہرے سے کب عیاں ہے ہمارے لبوں کی پیاس
جیسے سمندروں ہی میں ہے ساحلوں کی پیاس

رخسار وہ نہیں عرق آلود ہے سبب
کوشش میں ہے بجھانے کی شبنم گلوں کی پیاس

قدوں میں رہ پروں کے ہمیشہ ٹپے ہے
منزل بچھانے پانی کبھی راستوں کی پیاس

بادل سمندروں پہ برس کر چلے گئے
جیسی کی ویسی رہ گئی پھر جنگلوں کی پیاس

صحرا نورد ہو گئے فرطِ جنوں میں ہم !!
خاروں کی پیاس ہے کہ ہے یہ لبوں کی پیاس

تشنہ لبی ہے ان کا مقدر تو کیا علاج؟
پی کر بھی اشک بھونہ سکی شاعری کی پیاس

کوئی برس کے پیاس بچھاتا ہے سو چیتے
سب سے پہلے رحیم جُدا بادلوں کی پیاس



”مجھ سے پہلے شہر میں تو آئینہ تھا ہی نہیں“
 میں ہی میں تھا اور کوئی دوسرا تھا ہی نہیں
 کوئی اول کوئی آخر دوسرا تھا ہی نہیں
 ذہنِ خالق میں یہ سچ ہے آپ سا تھا ہی نہیں
 دیدہ و دانستہ میں نے اوڑھ لی ہے تیرگی
 میری قسمت میں کوئی جلتا دیا تھا ہی نہیں
 بن گیا پتھر کا میں بھی اُن بتوں کے شہر میں
 اس طرف مجھ کو پٹ کر دیکھنا تھا ہی نہیں
 تھا خدا کا فضل خود طوفانِ ساحل بن گیا
 میری کشتی کا نگہباں نا خدا تھا ہی نہیں
 بند تھے اپنا انا کے خول میں ہم اس طرح
 کھل کے ملنے کا کسی سے راسخا تھا ہی نہیں
 میں تھا اس میں اور وہ مجھ میں سما یا تھا رحیم
 میرے اس کے درمیاں تو فاصلہ تھا ہی نہیں



وہ اب آئیں گے، وہ ابھی آرہے ہیں
 اسی آس میں ہم جتنے جا رہے ہیں
 خیالات اُن کے جوتڑ پار رہے ہیں
 وہ شاید مجھے یاد فرما رہے ہیں
 ہے ترک تعلق بھی الفت کا زینہ
 بھلانے کی خاطر وہ یاد آرہے ہیں!
 وہ آنکھیں وہ زلفیں وہ رخسار وہ لب
 مری آتش غم کو بھڑکا رہے ہیں
 بھلا مجھ میں تابِ نظر کیا رہے گی
 قیامت کے جلوے نظر آرہے ہیں
 چلے آؤ آنکھوں سے دل میں ہمارے
 یہیں آپ تشریف فرما رہے ہیں
 رحیم اپنے رخ سے وہ آئین اٹھا کر
 تصویر کی دنیا کو مہکا رہے ہیں



وفا کی قسمیں وہ کھا کر بھلائے جا رہے ہیں
 فریب ہنستے ہوئے ہم بھی کھائے جاتے ہیں
 کچھ ایسے لوگ بھی دنیا میں پائے جاتے ہیں
 جو زخمِ دل کو بھی ہنس کر چھپائے جاتے ہیں
 بھلائے بیٹھے ہیں ہم کو جو ایک مدت سے
 ہم اُن کی یاد میں آنسو بہائے جاتے ہیں
 کبھی خلوص کی شمعیں جلائی جاتی تھیں
 ہمارے دلش میں اب گھر جلائے جاتے ہیں
 ہمارے خواب ہیں آنکھوں میں منتشر کپے
 بے شکل اشکِ ہر گال پہ آئے جاتے ہیں
 یہ شاعروں کی بھی فطرت عجیب ہوتی ہے
 جہاں کے درد کو دل سے لگائے جاتے ہیں
 رحیم اُن کی غایت ہے زندگی اپنی !
 اگرچہ بوجھ ہے پھر بھی اٹھائے جاتے ہیں



جلوے اُسی کے نام میں پیر شے سے ہیں بچا
 کیا کوہِ طور، کیسی زمیں، کیسا آسمان
 ہم پور ہے میں آپ ہی اپنے سے بدگماں
 کیا جانے کب امان ملے گی، ہمیں کہاں
 انسانیت، خلوص، وقار، پیار، حُسن و عشق
 ان سب سجاوٹوں سے سجا ہے یہ قصرِ جاں
 شہِ رگ سے بھی قریب جب اس کا دھڑ ہے
 انسان ڈھونڈتا ہے اسے کیوں یہاں وہاں
 فکر و نظر کی کچھ حد پر واز ہی نہیں
 یہ شاعری تو جیسے ہے اک بحرِ بے کراں
 سالنوں کے ساتھ یادوں کا اک سلسلہ ہے
 ورنہ سمجھ لو زیست گئی اپنی رائیگاں
 کیوں ہم کو خوفِ گلشنِ عالم میں ہو رحیم
 جب برقِ اس کی اور سی کل ہے اشیاں



لاکھ بہلاتا ہوں تیں دل کو بہلتا ہی نہیں
”کیسا موسم ہے کہیں رنگِ تنہا ہی نہیں

کوئی پتھر بھی جو ہوتا تو پھل جاتا تھا
اُس نے زخموں کو مرے غور سے دیکھا ہی نہیں

آپ کے حُسن کے چرچے تو میں ہر سو لیکن
میرے افسانہ غم کا کوئی چرچا ہی نہیں

اپنے اشعار میں افکار کی حد ہوتی ہے
ایسا لگتا ہے کہ آگے کوئی رستا ہی نہیں

میری آنکھوں سے جو دیکھو گے نقس آئے گا
ان کے جلوے جسے کوئی بھی جلوہ ہی نہیں

ایک سنسان جزیرے میں کھڑا ہوں ایسے
ایک دیوانی ہے اپنی کوئی اپنا ہی نہیں

اے رحیم اس کو رگِ جاں میں بسایا میں نے
یادِ بچہ کیسے کروں جب کہ میں بھولا ہی نہیں

کس طرح اپنے عشق کی اس کو خبر کریں
 درپیش معرکہ ہے اسے کیسے سر کریں
 ہر گام پہ ہیں حادثے پس منظر یہاں
 زادِ سفر ہواں کی دُعا تو سفر کریں
 پچھتائی نہ ترکِ تعلق پہ بعد میں
 یہ فیصلہ ہے آپ ذرا سوچ کر کریں
 سہہ لیں خوشی سے دوست کی اک دین جان
 ہر غم کو اس طرح سے غمِ معتبر کریں
 بسمل بنا کے چارہ گری اب فضول ہے
 تاہم جو سعی ہے وہ ذرا تیز تر کریں
 پھیلی ہوئی ہے آگ فسادات کی یہاں
 ایسے میں رُخ نہ آپ ادھر بھول کر کریں
 خوگر ہیں ہم تو جو ردِ جفا ہی کے اے حسیم
 مرضی ہے ان کا خیر کریں یا کہ شر کریں

ہے یہ حسرت کبھی دیکھوں تو میں ایسا دیکھوں
 رُوح میں شعر کی تم کو ہی اُترتا دیکھوں
 راہ میں تیری نیکل جاؤں تو پھر کیا دیکھوں
 کوہ دیکھوں نہ سمندر نہ ہی صحرا دیکھوں
 شعر میرے تری مدحت کے سوا کچھ بھی نہیں
 چاہتا ہوں کہ ترے نام کو اُوخپا دیکھوں
 پیرہن میں ہے تیرے قوس و قزح کا منظر
 تتلیوں میں بھی تیرے رنگ کو بندھتا دیکھوں
 ذہن کے سانچے میں پھر ایک غزل ڈھلتی ہے
 روبرو تو ہو اگر تیرا سراپا دیکھوں
 ساری دنیا کے نظاروں سے مجھے کیا مطلب
 سامنے تو ہو تو دنیا کو کھلا کیا دیکھوں
 جس طرح کوئی سنورتا ہے نقور میں رحیم
 کاش ویسے ہی مقدر کو سنورتا دیکھوں

جب سے اک چہرہ نیا ہے شہر میں
 ”ایک ہنگامہ بچا ہے شہر میں“
 معجزاتِ زندگی کیسے کہوں ؟
 زندگی خود معجزہ ہے شہر میں
 کادوں میں پہلی سی وہ خوبی کہاں
 کادوں سا رابطہ گیا ہے شہر میں
 کیوں ہنو گی اس کی مٹی بھی عزیز
 میرا بچپن گھومتا ہے شہر میں
 آئے جتن حیراغاں کیجئے
 ایک میرا گھر بچا ہے شہر میں
 شہر کی گلیوں میں تاریکی کا راج !
 کیا یہ سورج سو گیا ہے شہر میں
 ڈھونڈتا ہوں اس کو گلیوں میں رحیم
 میرا بچپن کھو گیا ہے شہر میں



ان کو احساسِ غم ذرا بھی نہیں
 میرے اشکوں پہ تبصرہ بھی نہیں
 وہ بلاتے ہوں میں گیا بھی نہیں
 ایسا اب تک مگر ہوا بھی نہیں
 پارہا ہوں سزا اس اُلفت کی
 جس میں میری کوئی خطا بھی نہیں
 تم جو مل جاؤ کون آئے
 یہ مرض کوئی لادوا بھی نہیں
 شرم سے سُرخ ہو گیا چہرہ
 میں نے ایسا تو کچھ کہا بھی نہیں
 کیجئے آپ مجھ پہ مشقِ ستم
 آپ سے مجھ کو کچھ گلہ بھی نہیں
 ان کے ہاتھوں میں مہر و ماہ ہیں حسیم
 اپنے گھر میں اک دیا بھی نہیں



یہ مانا کہ اس میں فُضائل بہت ہیں !
مگر عاشقی میں مسائل بہت ہیں !

مجاز و حقیقت کے فولادی پردے
محبت کی راہوں میں حائل بہت ہیں
ہو مندر کہ مسجدِ کلیسا کہ گرجا
پہنچنے وہاں تک وسائل بہت ہیں
وہ دستِ جنوں ہو کہ طوقِ خُرد ہو
گلے میں ہمارے حائل بہت ہیں

وہی بیکلی، برہمی، بد دلی ہے ! !
ابھی باقیاتِ اوائل بہت ہیں
نہیں کامراں کوئی یہ بات الگ ہے
وگرنہ محبت کے قائل بہت ہیں
رحیم ایک فطرت پہ کوئی نہیں ہے
ہے دل ایک لیکن شمائل بہت ہیں



جل جل کے میں حالات کی بھٹی میں تپا ہوں
 تب جا کے کہیں دوست کو گن دن سبنا ہوں
 مرے پوچھنا یہ مجھ سے کہ میں کون ہوں کیا ہوں
 اس دورِ جفا کیش میں آوازِ وفا ہوں
 کس حال میں جیتا ہوں تباہی نہیں کیے
 حاکم تھا کبھی آج میں محکوم ہوا ہوں
 سب میری ترقی پہ ہیں انگشت بدنداں
 پتھر تھا کبھی آج اک آئینہ بنا ہوں
 اندازہ لگاؤ مری ویرانی دل کا !
 انسان ہوں سنسان جزیے میں کھڑا ہوں
 اک شمع فروزاں کی طرح علم و ادب کی
 جلتے ہوئے اوروں کو خیاباں رہا ہوں
 آلامِ زمانہ سے جہنم آج ہوں آزاد
 میں اپنی محبت کا گلہ گھونٹ چکا ہوں



ہونے والا کم اضطراب کہاں
 نیند ہی جب نہیں تو خواب کہاں
 نذر کردی تمہیں کو بینائی
 اب ان آنکھوں میں آبِ وقاب کہاں
 ہجر کی رُت ہے دل کے آنگن میں
 خار اُگتے ہیں اب گلاب کہاں
 لوگ کیوں غنم نظر ہیں محشر کے
 زندگی سے بڑا عذاب کہاں
 گھونٹ اشکوں کے آج پی لیں گے
 ”ساقیا آ۔ شرابِ ناب کہاں“
 زلف کے پیچ و تاب کے آگے
 زلفِ گیتی کے پیچ و تاب کہاں
 اُن کے چہرے کو پڑھ رہا ہوں حسیم
 اس سے بہتر کوئی کتاب کہاں



جب نہیں ان سے بات جاڑوں میں
 بے مزہ ہے حیات جاڑوں میں
 اک طوالت شبِ فراق میں ہے
 ایک لمبی ہے رات جاڑوں میں
 جیسے اک پُل صراط کا عالم
 وعدۃ التفات جاڑوں میں
 کوئی بے گھر غریب سے پوچھے
 کیسی گزری ہے رات جاڑوں میں
 منظر ہے لحافِ ارماں کی
 کپکپاتی حیات جاڑوں میں
 جسم و جاں بھی قریب ہوتے ہیں
 ہے یہی خاص بات جاڑوں میں
 ہے یہ موسمِ رحیمِ الفت کا
 ہے حسیں کا تیناں جاڑوں میں



ناؤ طوفاں میں ہے ساحل کے حوالے کر دو
 جتنے بھی غم ہیں سرے دل کے حوالے کر دو
 حال صیاد کو گلشن کو سنانا ہے اگر
 میری آواز عنادل کے حوالے کر دو
 توڑنا چاہو اگر کُفر کسی مشکل کا
 اپنی آسانی کو مشکل کے حوالے کر دو
 راہ گروں کا یہ پتھانہ کبھی چھوڑیں گے
 راستوں کو کسی متزل کے حوالے کر دو
 ہاتھ اٹھا ہوا اٹھا ہی رہے گا اس کا
 اس خزانہ بھی جو سائل کے حوالے کر دو
 موجِ طوفاں ہی میں رہنے دو ہماری کشتی
 کون کہتا ہے کہ ساحل کے حوالے کر دو
 بازیِ عشق اگر جیتنی ہو تم کو رحیم
 اپنے ارمان مقابل کے حوالے کر دو



میں ہوں سیلاب کی مانند سنبھالو مجھ کو
اس سے پہلے کہ بکھر جاؤں اٹھالو مجھ کو

میں تو پگھلا ہوا لوہا ہوں، تمہاری مرضی
جو مناسب ہو اسی سانچے میں ڈھالو مجھ کو

زندگی، موت میں کیا فرق ہے سمجھاؤ ذرا
اور الجھاؤ نہ بے ربط خباںو مجھ کو

مجھ سے ہمارا کہتا ہے مرا حِسام انا
جسمِ شیشے کا ہے میرا نہ اچھالو مجھ کو

ارضِ نفرت سے یہ کہنا ہے کہ جننے کیلئے
امن کا بیج ہوں لِلّٰہ اُگا لو مجھ کو

نا خدا ہے کہ سفینہ ہے جھنور یا ساحل
کس کی آواز یہ آتی ہے سچا لو مجھ کو

غم کو سینے سے لٹکائے ہوئے پھرتا ہے رحیم
غم کی تاریخ میں بھولونہ حوالو مجھ کو



تجھ پہ سانسوں کی حکومت نہیں دیکھی جاتی
 زندگی تیری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی
 دوستوں کا تو بھلا ذکر ہی کیا ہے ہم سے
 دشمنوں کی بھی مصیبت نہیں دیکھی جاتی
 لا نہیں سکتا کھلونا کسی بچے کے لیے
 اور اُتری ہوئی صورت نہیں دیکھی جاتی
 اپنے معیار سے وہ دستِ عطا بڑھتا ہے
 ”مانگنے والے کی حاجت نہیں دیکھی جاتی“
 خود فروشی کے عوض نام ہو اُدھپا اپنا
 ایسی صورت کسی صورت نہیں دیکھی جاتی
 سب سمجھتے گنہگارِ محبت مجھ کو !
 اُن کی معصوم شرارت نہیں دیکھی جاتی
 نکتہ چینوں کی یہ مجبوری ہے معلومِ حسیم
 کم لنگا ہوں سے حقیقت نہیں دیکھی جاتی



فلسفہ تیسرے کو سمجھا گئی اک چیونٹی
”مستقل پیہم مسلسل امتحاں ہے زندگی“

تخلیہ کرنا پڑے گا اب نہیں تو کل ہی
ہے کرایہ کا مکتاں کہتے ہیں جس کو زندگی
ان کے جلوؤں سے ہے مثل صبح روشن گھر
اُن کی زلفوں سے ہے رنگِ شام گہرا سر
کر گئی سیراب کھیتوں کو وہ اک ماں کی طرح
اچھی ہے ٹھیرے ہوئے دریا سے اک ہتی ندی

فہم و دانش سے خدا کا جانا مشکل نہیں
چاہیے انساں میں پہلے جذبہ خود آگہی
مصلحت بازی نے خود داری کا سودا کر لیا
ہے انا کا قتل بے شک نفس سے وابستگی

غیر کے ہاتھوں میں نظم سیکھ رہا ہے اب حمیم
جام خالی دیکھ کر بڑھنے لگی ہے تشنگی



”آگئی یاد شام ڈھیلے ہی
 بڑھ گئی لوحِ چراغِ جلنے ہی

دوست سائے بدل گئے نکلت

میرے حالات کے بدلے ہی

ایک طوفانِ آرزو اُٹھتا

دل میں آسمانوں کے چلنے ہی

آدمی سانپ بن کے ڈس لے گا

حد سے آگے آنا نہکلے ہی

ہم اُجھالے بھور نے بھلے

آس کے اک دیپے کے جلنے ہی

سرِ کچل دینا چاہیے اُس کا

دل میں نفرت کا ناگ پلٹے ہی

صبحِ محشر ہوئی طغیانیِ رحیم !

اک قیامت کی رات ڈھلے ہی

ہمت جو اپنی عزیمت تک نہ آئے گی
 منزل قریب کیا ہے نظر تک نہ آئے گی
 سورج کی روشنی جو قمر تک نہ آئے گی
 پھر چاندنی کسی کے بھی گھر تک نہ آئے گی
 تقسیم گھر کو کر دے گا شک اس کمال سے
 دیوار درمیاں کی نظر تک نہ آئے گی
 میرے مکان پہ کندہ ہے اے دوست تیرا نام
 یہ کسی بھی ہو بلا مرے گھر تک نہ آئے گی
 جب تک صدف کا منہ نہ کھلتی پتی ریت پر
 کوئی چمک دمک بھی گہر تک نہ آئے گی
 یہ سوچ کر جلانے گھر کو پڑوسن کے
 کیا اس کی آغ آپ کے گھر تک نہ آئے گی
 کیسے وہ سایہ دے گا کسی کو بھی اے رستم
 جب دو پہر کی دھوپ شجر تک نہ آئے گی



چاند تاروں سے بھی آگے ہے رسائی اپنی
 ہم نے منزل ہی بہت دُور بنائی اپنی
 ہم سے کتر کے ترقی بھی نہیں کر سکتے
 بال انہاروں میں ہے شال یہ اکائی اپنی
 جھوٹ لاکھوں میں بکا کرتی ہے اب بھی بسکین
 ہم لیے پھرتے ہیں انمول سچائی اپنی
 ہم پہ یہ راز بہر حال ہوا بے فشا
 ہے خدا اپنا تو پھر ساری خُائی اپنی
 آنکھیں رکھ کر بھی نہیں دیکھتے ہم دنیا میں
 غیر کی نیک روش اور بُرائی اپنی !
 ہم جو دشوار پسندی کے ہوئے ہیں قائل
 محفل شوقِ حوادث کے سبجائی اپنی
 رُوح تو جسم کے زندال میں مقید ہے تحیم
 جیتے جی کس طرح ممکن ہے رہائی اپنی



جدھر دیکھو ہے کاوشِ امتحاں کی
 اسے کہتے ہیں گردشِ آسماں کی
 اُتر آیا ہے جب سے چاند گھر میں
 مرے دل پہ ہے بارشِ ہمتاں کی
 پہنچ ہی جائیں گے اس آستان تک
 اگر سچی ہو خواہشِ آستان کی
 کسی کی یاد میں ایسا ہوا گم
 سنانی دی نہ شورشِ دو جہاں کی
 جلائے دل یہاں بھونروں کے گل نے
 اسے کہتے آتشِ گلستاں کی
 وہ طوفانوں سے کیسے بچ سکیں گے
 جو کرتے ہیں پرشِ بادباں کی
 رکھو قابو میں تم اپنی زباں کو
 رحیم اک شر بھی ہے لغزشِ زباں کی



آئے گی قضا جب بھی کیا اس کے سوا دے گی
میٹھی کے کھلونے کو میٹھی میں ملا دے گی

ممکن ہو بھادینا اُلفت کی گھٹ بن کر
چنگاری یہ نفرت کی اک آگ لگا دے گی

تا شیرِ روا کہنا، خوش فہمی انساں ہے
ہو گا جو کرم اس کا میٹھی بھی شفا دے گی

ہو عزمِ مصمم تو دشوار نہیں راہیں
منزل کی لنگن اہم کو منزل کا پتا دے گی

ہوتی ہے اگر بارش اشکوں کی تو ہونے دو
جو آگ ہے یادوں کی اس کو تو بجھا دے گی

آنے دو ذرا اس میں اسلاف کی خود بینی
انساں کو نئے سر سے انساں بنا دے گی

اچھی ہے رحیم اتنی لازم ہے انا جتنی
بڑھ جائے اگر حد سے پستی میں گر دے گی

کب سے سبجا کے رکھا ہے بازارِ زندگی
 ملتا نہیں ہے کوئی خریدارِ زندگی
 انسان ہے ازل سے گرفتارِ زندگی
 وہ جانتا ہے کیسی ہے رفتارِ زندگی
 کوزے میں ہم نے جیسے سمندر سمو لئے
 اشعار میں سمیٹے ہیں افسکارِ زندگی
 کوئی سمجھ نہ پایا کہ انسان اصل میں
 مجبورِ زندگی ہے کہ محنتِ زندگی
 ہر غنچہ مری روحِ محبت کا کھل اٹھا
 مہر کا ہے لمسِ یار سے گلزارِ زندگی
 ہے اپنا حسنِ ظن کہ اٹھاتے ہیں اس کے ناز
 خود کو سمجھ سمجھ کے خطا واپہ زندگی !
 بنیائی کی نہیں ہے کوئی شرط اے رحیم
 ہوتا ہے ہر بصیر کو دیدارِ زندگی

کہلتے نہیں کسی پہ جب اسرارِ زندگی
کسے بتائے کیا ہے وہ معیارِ زندگی

ہم اپنی ذات ہی میں جو محصور ہو گئے
اب تک سمجھ نہیں سکے پندارِ زندگی

تسخیرِ کائنات کا انسان ہے مستحق
اس کے لیے سہا ہے یہ بازارِ زندگی

انسان لاکھ گردشِ حالات میں رہے
ہوتا نہیں کبھی بھی وہ ہینزارِ زندگی

ہم نے اٹھایا بارِ امانت بعدِ خلوص
ہے جانِ ناتواں پہ یہ کہسارِ زندگی

کیا جانے کس گھڑی دہرے سے چھین لے
رکھی ہے میرے سر پہ عودِ شاہِ زندگی

آنکھوں میں اشک اور ہے لبِ ہنسی رحیم
ہوتے ہیں اس طرح کے بھی آثارِ زندگی

اس سے بڑھ کر کیا قضا لے جائے گی
ہم سے جینے کی ادائے لے جائے گی

نفرتوں کے پیڑ کتنے ہی اُگیں
وقت کی آندھی اڑا لے جائے گی

دھوپ ڈھل جائے تو چہر سایہ کہاں
دھوپ سایے کو اُٹھا لے جائے گی

زندگی کیا پتھروں کے شہر میں
جسم اپنا سا پنچ لے جائے گی

یوں فضاؤں میں نہ لہراتے پھرو
زلف کی رنگت گھٹا لے جائے گی

وہ نہیں آئیں گے لیکن اُن کی یاد
مجھ سے مجھ کو ہی چُرا لے جائے گی

میرے پاس آتی نہیں کوئی بلا
آئے گی بھی وہ تو کیا لے جائے گی

عزم گر زادِ سفر بن جائے گا
منزل آئے خود بلا لے جائے گی

یاد سے رشتہ رکھو قایمِ رحیم
عمر بس اس کے حوالے جائے گی

عنایت اُن کی جب بے انتہا تھی
 کبھی ہی پھر مجھے دسیا میں کیا تھی
 وہ ہم کو کر کے رخصت روپے تھے
 ہمارے عشق کی یہ انتہا تھی
 رہِ غم میں نہ آیا ساتھ کوئی
 رہا ہے صرف سایہ بن کے ساتھ
 اٹھائے ناز بھی ہنس ہنس کے اُس کے
 یہ مانا زندگانی بے وفا تھی
 کہاں تک میں نہ تھکتا چلتے چلتے
 تمہاری آرزو تو راستا تھی
 مرے احباب کے ہاتھوں سے
 نوازش پتھروں کی بھی یہ کیا تھی
 رحیم اب تک کیا جو ضبطِ غم کو
 تقاضائے وفا تھا یا انا تھی !!



آزاد ہو گئے ہیں مگر ہے گھٹن ابھی!
منزل بھی مل گئی تو ہے رُخ پڑھکن ابھی!

اچھا ہی ہے رہیں جو عنادل چمن سے دُور
بیٹھے ہوئے ہیں شاخ پہ زارِغ و زرخن ابھی

ہوتا ہے کامیاب تو دل میں یہ رکھ خیال
ہم کو نکھارنا ہے یہاں اپنا فن ابھی!

اپنی زبان دانی پہ ہرگز نہ آئے آخ
اہلِ زبیاں ہیں خیر سے اہلِ دکن ابھی

ماں باپ کی دُعاؤں سے ہو جاؤ تم نہال
اس سے بڑا نہیں ہے زلزلے میں دھن ابھی

شاید تسلیوں میں کوئی حسان ہی نہیں
ماٹھے پہ ہے غریب کے باقی شکن ابھی

ہے کائناتِ رُوح معطر مریِ حسیم
شاید گیا ہے پاس سے وہ گلبدن ابھی



ایسا بھی نہیں مجھ کو تری آس نہیں ہے
 تُو، ہو کے مرے پاس مرے پاس نہیں ہے
 کس طرح مٹاؤں گاتہ انام میں دل سے
 یہ دل ہے کوئی صفحہ قرطاس نہیں ہے
 آزاد ہو ایں بھی میسر نہیں مجھ کو
 افسوس کہ ہوں شہر میں بن پاس نہیں ہے
 ہے دل ہی مرا آج مری جان کا دشمن
 لگتا ہے محبت ہی مجھے لاس نہیں ہے
 ہو آنکھ تو پتھر میں بھی ہیرا نظر آئے
 اندھے کو تو الماس بھی الماس نہیں ہے
 اس واسطے منزل سے ہیں بیگانہ وہ احباب
 اجداد کے اقدار کا اب پاس نہیں ہے
 شعروں میں رحیم اپنے ہوں کیوں غم دوراں
 شاعر ہی نہیں ہے وہ جو حساس نہیں ہے



حُسنِ جاناں بھی کتنا پیارا ہے
کبھی شبنم کبھی شرارا ہے

اک قری یاد کا سہارا ہے
ورنہ جینا کسے گوارا ہے

اس پہ جو روستم روا نہ رکھو
دل بہارا نہیں تمہارا ہے

ہے سمندر یہ زندگی بے شک
موت اس کا مگر کتنا ہے

میری نس نس میں آ کے بس جاؤ
میری نس نس پہ حق تمہارا ہے

ہم بھر دے پہ رہ گئے اس کے
ہم کو تفتدیر ہی نے مارا ہے

صبح روشن ہے اس کے کُرخ سے حتم
زُلف سے رات کا نظارا ہے



بُھکت رہا ہوں جُدائی کی میں سزا کب سے
 جلائے بیٹھا ہوں یا دلوں کا اک دیا کب سے
 خلاف کس لیے ہاتھ کا ہوا دستاویز
 دلوں میں آگیا دونوں کے فاصلہ کب سے
 ذرا سی دھوپ کے بچنے کے واسطے ناہق
 اٹھائے بیٹھا ہوں احسان پیر کا کب سے
 وہ آئیں یا کہ نہ آئیں یہ اُن کی مرضی ہے
 مگر ہے بزم میں اُن کا ہی تذکرہ کب سے
 یہ انتظار کی گھڑیاں طویل ہیں کتنی !
 میں تک رہا ہوں شب و روز راسخ کب سے
 حصارِ ذات سے باہر نکل نہیں سکتا
 اسیرِ لطفِ آنا ہے وہ پار سا کب سے
 میرے نصیب میں دیدار ہی نہیں ہے رحیم
 نہ جانے مجھ سے ہے میرا خدا خفا کب سے



اپنی خود دار طبیعت کا سہارا ہے مجھے
 کب کسی کا کوئی احسان گوارا ہے مجھے
 حادثوں نے ہی سنبھالا ہے نکھارا ہے مجھے
 موجِ طوفان بھی سمندر میں کٹا رہا ہے مجھے
 کان دھرتا تو یقیناً میں سنبھل سکتا تھا
 ہرگز رتے ہوئے لمحے نے پکارا ہے مجھے
 اس سے بڑھ کر مرے جینے کی سزا کیا ہوگی
 خود مرے دل کی تمناؤں نے مارا ہے مجھے
 ہر قدم پہ میں ٹھٹھک جاتا ہوں گر جاتا ہوں
 ایسا لگتا ہے کہ تو نے ہی پکارا ہے مجھے
 جس نے دیکھا مجھے محرومِ تمت سنبھا
 نامرادی نے مری اتنا اُبھارا ہے مجھے
 کر دیا کارِ جہاں بانی مرے ذمہ رحیم
 اس زمیں پر یونہی کبکس نے اُتارا ہے مجھے



اگر ہے واسطہ لازم اُسی سے
 تمہارے غم کو سہہ لیں گے خوشی سے
 مناظر دیکھ کے جلتے گھروں کے
 نظر ڈرنے لگی ہے روشنی سے
 یہی ہے انقلابِ وقت شاید
 ہے خائف آدمی اب آدمی سے
 نہیں ہے اعتبارِ زلیت ہم کو
 بہت دھوکے ملے ہیں زندگی سے
 تھے اب تک بدر سے امن و امان کے
 مساجد ہوں منادریا کیلئے
 نہیں کوئی یہ اندازِ پرستش
 بچو تم اے پتنگِ خود کشی سے
 رحیم اٹھ کر قیامت رہ گئی ہے
 ملے ہم سے وہ بن کر اجنبی سے



اے جذبِ شوقِ روزِ در کا پتہ تو دے
 دیدارِ دوست کی کوئی صورت دکھا تو دے
 خود جل اُٹھے گا شان سے اُلفت کا دیپ بھی
 نفرت کی آگ بھڑکی ہے اس کو بھجا تو دے
 منزلِ قریب تر ہے قدم تیز کیجئے
 کوئی مسافروں کو یہ مژدہ سنا تو دے
 سائل کو اپنے در سے نہ ٹوڑا دے خالی ہاتھ
 ہے تیرے پاس اپنے خدا کا دیا تو دے
 اتنی تو کم سے کم رہے انسانیت کی لاج
 خوں ریزیوں کی رسم کو رسماً اٹھا تو دے
 جُگنو کی روشنی بھی نظر آئے گی تجھے
 جلتے ہوئے چراغِ مکاں کے بھجا تو دے
 کھل جائیں گے رحیم سب اسرارِ بے خودی
 حرفِ خودی جو دل پہ ہے اُس کو بٹا تو دے



شمعِ اُفت کی ہر اک دل میں جلا دی جائے
 تیرگیِ ظلمت و نفرت کی مٹا دی جائے
 اپنے ہیں ارض و سما بڑھ کے مسخر کیجے
 کہیں ضائع نہ خدا کی یہ منادی جائے
 آگ دھیمی ہے مرے دل میں کسی کے غم کی
 اس کو محبوب کے دامن کی ہوا دی جائے
 جو جدا بھائی کو اک بھائی سے کر دیتی ہے
 ایسی دیوار ہو آنگن میں توڑ دھادی جائے
 خاک ہو جائیں نہ سب جل کے دھماکوں میں
 ایسی نفرت کی نہ بارود پچھا دی حبائے
 ہے جو تہذیب ہماری وہ ہے گنگا جمنی
 یوں نہ جنمائیں وہ نفرت سے بہا دی جائے
 اپنے اسلاف سے سیکھا ہے یہ ہم نے رحیم
 اپنے دشمن کو بھی جینے کی دعا دی جائے



گھنی شاخ برگد کی جب سے کٹی ہے
پزندوں کی دُنیا میں اک کھلبلی ہے

ہماری طبیعت میں جو برہمی ہے
یہ بے جس زمانے سے ہم کو ملی ہے
مآلِ محبت میں یہ دل یہ آنکھیں
ادھر تیرگی ہے ادھر روشنی ہے

ہے عالم میں اب تو قیامت کا عالم
جدھر دیکھتے بے حسی بے حسی ہے

نوازشِ کرمِ شکر یہ مہرِ بانی
متاعِ غنیمتِ دل عطا تم نے کی ہے
کیا باغِ بآں نے یہ گلشن کا عالم
نہ پھولوں میں خوشبو نہ کچھ تازگی ہے

رحیم اپنے اشکوں کو پیتے ہی رہیے
مئے ارغوانی سے یہ مئے بھلی ہے



ہے پیشِ سفر دشتِ کاہیں پاؤں میں چھالے
 لیکن نہ رکھیں گے کہیں رستے میں جیلے
 ایسا نہ ہو عفریتِ زمانہ کہیں کھالے
 جانا ہے بہت دور تجھے مال کی دُغالے
 یہ رنجِ و الم، آہ و بکا، اشکِ ینالے
 سب اس کی امانت میں رکھو اس کو سنبھالے
 ممکن ہے کہ چھٹ جگے شبِ غم کا اندھیرا
 پلکوں پہ تو اشکوں کے تاروں کو سجالے
 یہ عشق کی سوغاتِ عنایت ہے اُسی کی
 رکھا ہے بڑے ناز سے جس درد کو پالے
 اک فاختہ ہے اس کی اُڑتی ہوئی لیکن
 لاکھوں میں شکاری یہاں بندوقِ سنبھالے
 ہے راہ کا پتھر تو حسیم اپنی انا خود
 ممکن ہو اگر راہ سے پتھر کو ہٹالے



دُنیا یہ ہوتی جاتی ہے شعلوں کے حوالے
یا رب یہ تری خاص ہے تخلیق بچالے

یہ جنگ و جدل خون خرابہ یہ تباہی
ہر سمت فساد کی ہے ہر انداز نرالے

اک جنگ کے جنگل کو بسانا نہیں بہتر
ممکن ہو تو اک امن کا پودا پی اُگالے

بارود کے اک ڈھیر پہ بیٹھی ہے یہ دُنیا
چنگاری جوں جائے پڑیں جان کے لالے

ہے زمیں نشانوں کی کلیسا ہو کہ کعبہ
یا رب یہ ترے گھر ہیں انھیں تو ہی بچالے

دس لیس گے کسی روز خبر تک نہیں ہوگی
سانپوں کو کوئی دیدہ و دانستہ نہ پالے

ہر سمت ہی نفرت کے حریم آج اندھیرے
میں بانٹنے نکلا ہوں محبت کے اُجالے



آگئے خواب میں زلفِ بچیاں لیے ہم بہت دیر تک دیکھتے رہ گئے
 جیسے ساکن سمندر میں کنکر گراؤر تک دائرے دائرے رہ گئے
 مسجدیں ٹوٹ کر بندریں ٹوٹ کر اینٹ پتھر سے بن جائیں گے پھر مگر
 اُن دلائل کا بتاؤ کہ کیا حال ہو؟ جو فسادوں میں ٹوٹے ہوئے رہ گئے
 گھر کے بازو تو گھر تھا اسکے بھائی کا ذہن اس کی طرف تو نہیں جاسکا
 گھر ہمارا جلا تو جلا کس طرح ہم اسی بات کو سوچتے رہ گئے
 ریت کے ہم گھر فندے بناتے رہے اور انھیں سپورٹ سجاتے رہے
 لہرائی بہا کر انھیں لے گئی اور ساحل پہ ہم تاکتے رہ گئے
 ایک ٹوٹے پہ ہم نے بھروسہ کیا، اپنے اپنے مقدر کا سودا کیا
 کہہ دیا جانے کیا روپیے کے لیے اپنے دل میں نقطہ سو رہ گئے
 گیسوئے گیتی سلجھے نہیں آج تک جبکہ بدلے گئے تاج اور جہک
 جس طرف بھی نگاہیں اٹھیں اس طرف مسئلے مسئلے رہ گئے
 زندگی اک دکھتی ہوئی آگ ہے زندگی حُسن ہے زندگی راگ ہے
 زندگی اے رحیم اک محمد ہے کیا؟ بوجھ پائے نہ ہم بوجھتے رہ گئے



میرے احساس کا انکار کا محور تو ہے
 میں تو مظہر ہوں ترا اک مرے اند تو ہے
 جب ذرا غور سے دیکھا تو یہ محسوس ہوا
 جا ہے منظر ہو کوئی دس پس نظر تو ہے
 اتنا خوش رنگ ہے نازک ہے حسین ہے پیکر
 ایسا لگتا ہے کشتلی کے پروں پر تو ہے
 میں کروں تیری بڑائی کا احاطہ کیسے
 میرے اندازہ انکار سے بڑھ کر تو ہے
 دیکھ کر مجھ کو یہ کہتے ہیں سبھی اہل نظر
 خوگر صبر ہے، اخلاص کا پیکر تو ہے
 کوئی پتھر ہو اُسے حُسن کا پیکر کر دے
 ہاتھ میں شیشہ ہے اور وقت کا آذر تو ہے
 فتح انسان کا دل کر لے جو ممکن ہو حسیم
 ہے قلم ہاتھ میں تلوار سکنڈ تو ہے



ہاتھ میں بندوق لے کر جب اُڑا دینے لگے
 سارے پیروں کے پرندے بددعا دینے لگے
 سب ہاجرا اپنے اپنے گھر سے یوں رخصت ہوئے
 بکھرے پتے جیسے پت جھڑکا پتہ دینے لگے
 فکر کی شمعیں جلائیں ہم نے بزمِ جہل میں
 ہاتھ میں اندھے کے جیسے آئینہ دینے لگے
 یوں دھاکے ہو گئے معمول اپنے ملک میں
 اب پٹا خے بھی ہمارا دل ہلا دینے لگے
 قتل بھی ہم ہی ہوئے قاتل بھی ٹھہرائے گئے
 بحرِ مانِ وقت ہی ہم کو سزا دینے لگے
 اک جھلک میں کوش کوئی چھین کر چلتا بنا
 دیدہ و دل دیر تک اس کو صدا دینے لگے
 زندگانی بھر کی پونجی لوٹ لی جس نے رحم
 ہم اسی کو زندگانی کی دُعا دینے لگے



یہ تیرا فیض مسلسل خدائے برتر ہے
 ہمارے سینے میں جو ایک تلب مضطر ہے
 بتاؤ نیند اب آئے تو کس طرح آئے
 بدن کے نیچے تو اک گھوکھرو کا بستر ہے
 میں سانس لیتے ہوئے بھی جھجکتا رہتا ہوں
 فضا کے ملک ہی کچھ اس طرح مکد ہے
 جدا ہو کیسے صفت شر کی آج انساں
 بشر کے لفظ میں پوشیدہ دوستو شر ہے
 نفسی نفسی یہاں عام حشر کی مانند
 ہر ایک روز یہاں جیسے روزِ محشر ہے
 اُمید، آس، الم، آرزو، تمنائیں
 ہمارے دل میں کمی کیا ہے سب بستر ہے
 رحیم کیسے جہاں میں سکون ہو حاصل
 ہمارے ذہن میں سوچوں کا ایک دفتر ہے

زندگی ہے صرف اس پر وارنے
 کر دیا بے خود نگاہِ یار نے
 کام جو کچھ بھی کیا تلو اس نے
 اس سے بڑھ کر کر دیا کردار نے
 تابِ نظارہ نہیں ہے آنکھ میں
 کہہ دیا ہر طالبِ دیدار نے
 جو ملے رنج و الم سنساریں
 مسکرا کر سہ لیے فنکار نے
 عشق کا حاصل فروغِ بے خودی
 یہ بتایا ہے صلیب و دار نے
 مسخِ قدریں زندگی کی ہو گئیں
 رکھ دیا ہے روند کر سنسار نے
 کر دیا مسخِ مجھ کو اے حکیم
 ”یار کے پارِ لب کی بھنکار نے“

خدا کرے دلِ بے تاب کو قرار آئے
 خزاں کے دود میں اک بار پھر بہاؤ آئے
 تمہارے در پہ جو اک لمحہ ہم گوار آئے
 تو ہم کو ایسا لگا زندگی سنوار آئے
 خود اپنے آپ کو پہچاننا بھی مشکل تھا
 ہم اپنے چہرے سے جب بھی نقاب اٹا آئے
 تمہارے شہر میں کُٹے رہے ہیں ہم پھر بھی
 نہ جانے کسی کشش تھی کہ بار بار آئے
 تمہارے در پہ بہائے ہیں دیر تک آنسو
 بہائے ذہن پہ اک بوجھ تھا اتار آئے
 ملی ہے عشق کی سوغات اپنے دامن کو
 تمہاری بزم سے جب آئے اشک آئے
 ہماری داستاں غم ناک اس قدر ہے رحیم
 ”اگر کہیں تو کسی کو نہ اعتبار آئے“



حالات میں چین سے سونے نہیں دیں گے
 سو پائیں بھی تو سینے سلونے نہیں دیں گے
 یہ دور دھما کو ہے اسی واسطے اے دوست
 ہم بچوں کے ہاتھوں میں کھلونے نہیں دیں گے
 یہ زہر زمیں پر تو کسی طرح نہ پھیلے
 ہم بیجِ نقصب کے تو بونے نہیں دیں گے
 موتی کی طرح رکھیں گے اشکوں کو چھپا کر
 ہم اپنے بھرم کو کبھی کھونے نہیں دیں گے
 مظلوم کو بزدل ہی کہا کرتے ہیں لیکن
 ظالم سے مگر ظلم کو ہونے نہیں دیں گے
 ہم جانتے ہیں کس کی بدولت ہے تباہی
 کچھ لوگ ہیں جو امن ہی ہونے نہیں دیں گے
 شہرت نہ چلی جائے غریبی کی رحیم اب
 بچوں کو تو ہم پیغنے رونے نہیں دیں گے



کیسا انصاف ہے مقتول ہی قاتل ٹھیرے
اور قاتل جو ہے سفاک وہ عادل ٹھیرے

قابلِ قدر ہمارا ہے یہ عزمِ محکم !
اپنی دہلیز پہ رہتے ہیں مسائل ٹھیرے
منزلِ تکتی رہیں اپنے ہی قدروں کے نشان
کب کہاں اہل جنوں طالبِ منزل ٹھیرے
کتنے معصوم ہوئے غرقِ مہنوریں لیکن
دیکھتے رہ گئے خاموش یہ سائل ٹھیرے

تھا نظر سوز تیرے حُسن کا جلوہ ایسا
غیر ممکن تھا کوئی تیرے مقابل ٹھیرے
اپنی غُربت کو چھپاؤ کہ یہی بہتر ہے
ٹھیک لگتا نہیں دروازہ پہ سائل ٹھیرے
سازشیں میری تباہی کی جو کرتے ہیں رحیم !
ہاں ! وہی حلقہ احباب میں شال ٹھیرے



دل کے صحرا سے کسی کی یہ قدا آئی ہے
 یہ جو دنیا ہے محبت کی تماشائی ہے
 اک مرے دل میں ہیں آلام زمانے بھر کے
 بھیڑ کی بھیڑ ہے تنہائی کی تنہائی ہے
 رفعتِ حُسن کا معیار ہے گر حُسن ترا
 عشق میں میرے سمندر کی سی گہرائی ہے
 اب غمِ عشق کی دولت سے نواز اے مالکِ
 غمِ دوراں سے تو برسوں کی شناسائی ہے
 کچھ تعلق بھری برسات سے ہوگا ورنہ
 ایسے موسم میں تری آنکھ کیوں بھر آئی ہے
 میری تنہائی سے واقف نہیں شاید کوئی
 ورنہ کیوں اتنا اُسے دعویٰ یختائی ہے
 نازشِ لوح و قلم ہم تو نہ بن پائے رحیم
 ہاں مگر دوست کو تحریہ پسند آئی ہے



کچھو کے ایسے لگتا ہے یارِ غار مجھے
 کہ اپنے آپ سے ممکن نہیں فرار مجھے
 سمجھ رہی تھی یہ دنیا ذلیل و خوار مجھے
 تمہاری چاہ نے رکھا ہے ذی قار مجھے
 چلا گیا ہے کوئی کر کے اشکبار مجھے
 نہ جانے کیوں ہے اسی کا پھر انتظار مجھے
 اُمید و بیم میں کیوں در بدر بھٹکتے ہو
 وہ کہہ رہا ہے کہ ”بندے ذرا پکار مجھے“
 گلہ ہے دوست سے کوئی نہ شکوہ دشمن سے
 کہ لے کے ڈوبا ہے خود میرا اعتبار مجھے
 کہیں میں گیسوئے آلام میں نہ بھینس جاؤں
 نہ چھوڑا کیلا کسی وقت زلفِ یار مجھے
 ضمیر نام اسے دلوں تو کیا غلط ہے رحیم
 وہ جو جھنجھوڑتا رہتا ہے بار بار مجھے



کوئی سمجھائے لبوں پر کیوں نہیں متروک ہے
 رسم ہے دنیا کی یا میری خوشی متروک ہے
 دار پر منصور مجنوں دشت میں، سم در بدر
 ہر زمانے ہی میں گویا عاشقی متروک ہے
 ان سے ہونٹوں کا تبسم قتل کرتا ہے کسے
 ہاں مگر ہونٹوں پہ اپنے آہ بھی متروک ہے
 صبح سے ہے شام تک رنج و الم کا سلسلہ
 میرے دل کے حق میں شاید ہر خوشی متروک ہے
 پیاس سے ہم نے بھجائی تشنگی کی تشنگی
 اب ہمارے واسطے تشنہ لبی متروک ہے
 دن خیالوں میں کٹا تو رات آنکھوں میں کٹی
 کیا ہماری زندگی کی زندگی متروک ہے
 کیوں نہیں رکھتے اسی کا نام وہ فہرست میں
 کیا جیسے خستہ جال کا نام ہی متروک ہے



سلگے ہوئے تھے آپ کی یادوں کے دو دیئے
ہم ان کو ڈھال ڈھال کے اشکوں میں رو دیئے

تارِ نظری آپ نے آنسو پر رو دیئے
ہونٹوں نے مسکرانے کے انداز کھود دیئے

اے دوست تیرے عشق کی سوغات جان کر
محفوظ دل میں کر لیے غم تو نے جو دیئے

بھر دیں خوشی سے یا غم و آلام سے اسے
عرصہ ہوا ہے کاسۂ دل آپ کو دیئے

شبِ نیم نہیں ہے اشک میں کیا سمان کے
چہرے تجھوں نے شب میں گلوں کے بھگود کے

باتی رہا نہ کچھ بھی تصور سے وابستہ
آنکھوں میں جتنے خواب تھے اشکوں دھو دیئے

دے کر غم جُلائی مرے دوست نے رحیم
دل کی زمیں میں جلتے ہوئے خار بو دیئے



صلیب و دار سے رشتا ہے کیا کیا جائے
 انا کا پشتی سودا ہے کیا کیا جائے
 فسانہ ویش کا قرطاس پہ میں کیسے لکھوں؟
 قلم سے خون ٹپکتا ہے کیا کیا جائے
 ہر اک نفس میں ہے موجود نفس امارہ
 وہ اپنی ذات کا حصہ ہے کیا کیا جائے
 میں جلنتے ہوئے قاتل کو ہوں جو مہربان
 اسی سے خون کا رشتا ہے کیا کیا جائے
 نزاع دیر و حرم ختم کس طرح ہوگی
 دلوں میں تفرقہ بیٹھتا ہے کیا کیا جائے
 تمہارا نام میں بھولوں تو کس طرح بھولوں
 یہی تو میرا وظیفہ ہے کیا کیا جائے
 کسی بھی طرح سے کرنا ہے پاراں کو حسیم
 اگرچہ آگ کا دریا ہے کیا کیا جائے



اس کے ہاتھوں میں بھی دیکھے کئی پتھر میں نے
جس کو سمجھا تھا اک اخلاص کا پیکر میں نے

اپنے بازو پہ بھروسہ کیا اکثر میں نے
ان لکیروں میں نہیں ڈھونڈھا مقدر میں نے

کیسے اغیار کے عیبوں پہ نظر اٹھ سکتی
جب کہ دیکھا نہیں خود کو ہی برابر میں نے

مجھ کو ہر راہ میں چلنے کا سلیقہ آیا
جب سے کھائی ہے رہِ عشق میں ٹھوکر میں نے

لوگ مافوق سمجھنے لگے خود سے مجھ کو
اپنے آلام ہے اس طرح ہنس کر میں نے

آئینہ ہو کہ وہ بُت ہو کہ کوئی ہیرو ہو
کبھی رہنے دیا پتھر کو نہ پتھر میں نے

ہمیں ڈس لے نہ مجھی کو وہ کسی روز رحیم
نفس کی شکل میں پالا ہے جو اجگر میں نے



رہبر کی رہنما کی ضرورت ہے کیا مجھے
 جب مل گیا نصیب وہ نقشِ پا مجھے
 اچھا طلب ہے اُن سے وفا کا صلہ مجھے
 دُنیا پکارتی ہے شہیدِ وفا مجھے
 حلیہ بنائے پھرتا ہوں میں پارساؤں کا
 دُنیا سمجھ رہی ہے بہت پارسا مجھے
 رنگے فسادِ ریش میں معمول بن گئے
 اب قتل و خول بھی لگتا ہے اک حادثہ مجھے
 اس بار خاک ہو گئے بستی کے سائے گھر
 ملتا نہیں ہے اپنے بھی گھر کا پتہ مجھے
 میں راہِ حق پہ چلنے کا عانم ہوں دوستو
 ممکن نہیں کسی سے بھی اب روکنا مجھے
 میں اپنی خول و ذات میں ہوں بندائے رحم
 باہر نکلنے دیتی نہیں ہے اُنا مجھے !



غمِ جاناں سے گزرا ہے کبھی آلامِ دوراں سے
 ملا اس کے سوا کیا آدمی کو بزمِ امکاں سے
 کرو اس کی اطاعت تم سے جتنی ہو سکے ممکن
 دو عالم میں کوئی ہستی نہیں ہے محترم ماں سے
 مرے اشعار میں کیوں کر نہوں گی فکر کی شمعیں
 کیا ہے اکتسابِ فیض میں نے شمسِ تاباں سے
 مجھے ساحل پہ پہنچایا ہے خود اسواجِ طوفاں نے
 تمہارا نام لے کر جب بھی ٹکرایا ہوں طوفاں سے
 ہماری فکر کا شعر و ادب ایسا رشتہ ہے
 تعلق جس طرح قائم ہے اپنے جسم کا جاں سے
 ضرورت کے مطابق مجھ کو مل جائے تو کافی ہے
 غرضی ہے تخت و سند سے نہ طاؤسِ سلیمان
 مٹی جاتی ہیں شاید اے رحیمِ اسلاف کی قدریاں
 نہیں تو کیوں پھر انساناں جکل خالیٰ انساناں سے



”بہجوں آرزو میں اک مقام ایسا بھی آتا ہے“
 جہاں ملنے کُلتاں ہی نہیں صحرا بھی آتا ہے
 و فورِ عشق میں انسان آپے میں نہیں رہتا
 ہنسی آتی ہے خود پر اور کبھی رونا بھی آتا ہے
 اُمیدوں آرزوؤں کو لگاتا ہے ساتھ اپنے
 خیالِ یار لے ہدم کبھی تنہا بھی آتا ہے؟
 شبِ ظلمت میں تنہائی بھی ہم کو کاٹ کھائے گی
 اُجالا ہو تو اس کے ساتھ ہی سایا بھی آتا ہے
 ہے سوزِ حُسن کا پیکر جسے ہم شمع کہتے ہیں
 جلنا ہی نہیں آتا اُسے جلنا بھی آتا ہے
 ہم اپنی جاں بھری پر لے پھرتے ہیں دُنیا میں
 رہِ حق میں ہیں مرنا نہیں جینا بھی آتا ہے
 رہِ منزل میں بڑھتا ہے رحیم اک شیوہ مر داں
 وگر نہ لوٹ کے گھر کو تو اک اندھا بھی آتا ہے



تینوں موسم سے جدا اک موسمِ خونریز ہے
 اس کا خالق جو بھی ہو وہ آج کا چنگیز ہے
 کٹ رہے ہیں سرِ سیاہی فصول کی مانند
 ہاں! ہمارے دیش کی دھرتی بڑی زرخیز ہے
 یہ سستی کی رسم کتنے گھر جلائے کیا پتہ؟
 ہے چٹا کی آگ روشن اور ہوا بھی تیز ہے
 ناوکِ شرکاں سے زخمی ہو گئے ہیں قلبِ جاں
 آج سینے میں ہمارے درد دلاوینے ہے
 اشکِ ٹپکے کا تو ممکن ہے پھلک جائے کا یہ
 میرے آگے جو رکھا ہے جامِ غم لبریز ہے
 دیکھنا ہے آگے آگے کیا قیامت ٹھلے گی
 یہ عروسی شاعری میری ابھی نوخیز ہے
 ہے بڑے اوصاف کا کہتے ہیں جس کو سبِ حیم
 کم سخن کم فہم کم گو اور کم آمیز ہے



غزل دو قافیوں میں

کہتا ہے بھلا کون کہ مخدوم ہوا ہے
 انسان جب انسان کا محکوم رہا ہے
 اس طرح خزاں نے اُسے معدوم کیا ہے
 اب پھول کی خوشبو سے بھی محروم صبا ہے
 موسم کا تقاضہ ہے تکلف نہیں جائز
 اے رند! اٹھا جام ذرا جھوم گھٹا ہے
 چلنا ہو تو ہر راہ کے پیچھے کوہِ طاووس
 جینے کا ہنر آج یہ معلوم ہوا ہے
 مشکوک ہے حلیے ہی سے ہر اک کی نظر میں
 وہ شخص جو بستی میں نیا گھوم رہا ہے
 پروانے کی یہ راکھ ہے اس بات کی فضا
 وہ جلتی ہوئی شمع کے لب چوم چکا ہے
 معصوموں کی آہوں کا اثر کیا ہو رحیم اور
 ہر سمت مرے دلش کی مغموم فضا ہے



غزل دو قافیوں میں

چھپائے رکھتے ہی میں آبروئے قاتل ہے
ہمارا نفس ہی ہے جو عدوئے کمال ہے

عجیب منظرِ مقتل بہ روئے محفل ہے
کہ اُن کی تیغِ رستم بر گلوئے بسمل ہے

اٹوٹ رشتہ ہے یوں مجھ سے میر قاتل کا
کہ بعدِ قتل بھی آنکھوں میں روئے قاتل ہے

لکھا ہے ظلم ہی مظالم کے مُقرر میں
رستم پھر اس پہ کہ مسدود کوئے عادل ہے

عجیب مصلحت اندیش ہو گئی دُنیا !
کہ آج حق بھی یہاں دو بدوئے باطل ہے

ہر ایک کو نہیں ملتی نگاہِ کُطف و کرم
پہنچ سکے جو وہاں سرخروئے محفل ہے

چلو کہ سر کو کٹا دیں گے راہِ حق میں رستم
یہ سچ ہے جامِ شہادتِ سبوعےِ واصل ہے

یہ زندگی کٹھن ہے بہت پُلِ مِراط سے
 ہر اک قدم اٹھانا بڑی احتیاط سے
 ہم تو محیط ہیں وہ بسیط البساط ہے
 باہر اسی لیے ہے وہ اپنی بساط سے
 خوشیوں کے ازدیاد میں پوشیدہ غم بھی ہے
 مر بھی گئے ہیں لوگ دفورِ نشاط سے
 ہر ذرہ کیوں نہ اپنی جگہ آفتاب ہو
 ہمت وہ ہارتا ہی نہیں اغطاط سے
 بھوکے کو ایک نُقْمہ بھی نعمتِ کم نہیں
 آنکھوں سے اشک برس گئے پھر البساط سے
 روحِ فہدن میں کوئی تناسب نہیں مگر
 انساں بنا ہے ان کے ہم اختلاط سے
 حقے میں اس کے کیوں نہیں آئی خوشیِ رحیم
 باہر تھا کیا وہ مانگنے والا سماء سے

دُشوار تری راہ گزر ہے کہ نہیں ہے
 چہرے پہ مرے گرد سفر ہے کہ نہیں ہے
 ظلمات کے پردے میں سحر ہے کہ نہیں ہے
 اس دور میں ہر عجیب ہنر ہے کہ نہیں ہے
 پتے ہوئے صحرا میں ہے جو ایک نمی سی
 اعجاز ترا دیدہ تر ہے کہ نہیں ہے!
 دنیا کے حوادث سے گزر جاتا ہوں محفوظ
 یہ مال کی دعاؤں کا اثر ہے کہ نہیں ہے
 ہی خون کے دریا تو کہیں آگ کا جنگل
 ہر گام پہ اب خوف و خطر ہے کہ نہیں ہے
 محتاج ترے ایک سُسم کا ہے گلشن
 کلیوں کا تو منظورِ نظر ہے کہ نہیں ہے
 رہتی ہے حسیم اس کی خبر مجھ کو تو ہر دم
 اس کو بھی مری کوئی خبر ہے کہ نہیں ہے



زلفِ تقدیر کو اس طرح سنوارا جائے
 شدتِ غم میں بھی ہنس ہنس کے گزارا جائے
 اُن کی افتاتِ ذرا دیکھ سکیں گے ہم لوگ
 چاند سورج کو بھی دھرتی پہ اتارا جائے
 تیری صورت کو بھلاؤں تو بھلاؤں کیسے؟
 غیر ممکن ہے کہ نظروں سے نظر آجائے
 اپنی غیرت کو گوارہ نہ ہو اب تک بھی
 روبرو اوروں کے دامن کو پسارا جائے
 گھاؤ الفاظ کے بھی گھرے ہو کرتے میں
 کیا ضروری ہے کہ تلوار سے مارا جائے
 آرزو دل کی یہی اور زباں کی بھی یہی ؛
 نام ہر وقت اسی کا ہی لپکارا جائے
 ہم بھی جاتے ہیں رحیم اُن کے اشاروں میں
 جس جگہ اپنے مقدر کا ستارا جائے



جیت ممکن ہی نہیں پھر بھی لڑا کرتی ہے
 زندگی موت سے کب دیکے رہا کرتی ہے
 آنکھیاں لاکھ بھی نفرت کی بجھانے آئیں
 شمع اُلفت تو بہر حال جلا کرتی ہے
 خون کے اشک رُلانا ہے یہیں عشق ہنوز
 قرض ہے دل کا مگر آنکھ ادا کرتی ہے
 پیرہن اوٹھ کے الفاظ کا جذبات کیسا تھ
 فکر اشعار کے سانچے میں ڈھلا کرتی ہے
 کسی صحرا میں کھڑے پڑکی مانند یہاں
 زندگی رنج و الم ہنس کے سہا کرتی ہے
 زندگی کافی میں مفر رنج سے ممکن ہی نہیں
 ہر خوشی رنج کا عنوان ہوا کرتی ہے
 موج ٹکراتی ہے سُر اب بھی کناروں کے رحیم
 تشنہ کاموں کا جو ہے قرض ادا کرتی ہے



تعارف

- نام : محمد رؤف رحیم الدین
 ولایت : محمد شمس الدین تالاب مرحوم
 تاریخ پیدائش : ۱۰ جون ۱۹۵۴ء مقام پیدائش : حیدرآباد
 تعلیم : بی ای سی، ایم اے (اردو) عثمانیہ
 ملازمت : محکمہ بلدیہ حیدرآباد (سکندر آباد ڈویژن)
 مصروفیات : ۱. معتمد عمومی ادبستان دکن (رجسٹرڈ) بہ یادگار حضرت صفی اورنگ آبادی
 ۲. معتمد عمومی بزم حکمت سخن سب معتمد عمومی پاسبان ادب
 ۳. معتمد عمومی بزم جمیل
 ۴. شریک معتمد بزم قادریہ جمعیہ گولہ
 ۵. نائب معتمد زندہ دلائل حیدرآباد
 ۶. نائب معتمد بزم تالاب
 ۷. نائب صدر مینار ادب

☆ مصنف کی دیگر کتابیں :-

۱. زنجیر و زنار
 ۲. بسا و دل سنجیدہ کلام شعری مجموعہ بہ تعاون فخر الدین علی احمد سیوریہ کھٹی لکھنوی
 ۳. ۱۹۸۷ء میں اردو اکیڈمی آنصھر پرنش نے انعام سے نوازا۔
 ۴. گلوڑ صفی ۱۹۸۷ء کلام صفی اورنگ آبادی
 ۵. خدا خیر کرے مزاحیہ کلام ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا جسے اردو اکیڈمی نے انعام سے نوازا
 ۶. نشاط الم (سنجیدہ کلام کا مجموعہ) زیر نظر
 ۷. ترکش - مزاحیہ مضامین کا مجموعہ زیر ترتیب مزاحیہ مجموعہ کلام
 ۸. سہانا سفر لغت کلام کا مجموعہ زیر اشاعت
 ۹. بے نام - سنجیدہ مضامین افسانے اور ڈراموں کا مجموعہ زیر غور
 ۱۰. دل کے رشتے - انٹرویوز اور احباب پر مضامین زیر اشاعت

NISHATH-E-ALAM

BY: RAOOF RAHEEM

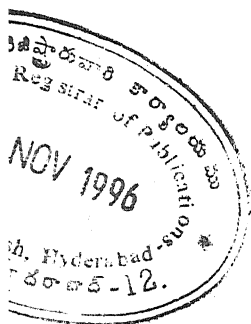


76

76

غم سے بلتا جھپٹیں سرور نہیں
زندگی کا انھیں شعور نہیں
(جگر)

نشاطِ آلم



شعری مجموعہ



روف حسین ایم اے

6
36